اقبال، ٹیگور اور نذرل

تین شاعر ـــــ ایک مطالعہ

ـــــ از ـــــ

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

اقبال، ٹیگور اور نذرل

تین شاعر — ایک مطالعہ

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

اشاعتِ اوّل ـــــــ ستمبر ۱۹۷۸ء
تعداد ـــــــ تین سو
قیمت ـــــــ دس روپے

خوشنویس ـــــــ فیض احمد صدیقی
طابع ـــــــ ہندوستان آرٹ پریس 19/A تریٹی
بازار اسٹریٹ۔ کلکتہ ۷۰۰۰۷۳

مصنف کا مکمل پتہ:-
شانتی رنجن بھٹاچاریہ
E/۲/۱ ۔ اشوک نگر ۔ ریجنٹ پارک
کلکتہ ۷۰۰۰۴۰

مصنف کی دیگر کتابیں

۱۔ راہ کا کانٹا
۲۔ شاعر کی شادی
۳۔ پختونستان کا مطالعہ
۴۔ بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات
۵۔ اردو کے ذریعہ بنگلہ سیکھو
۶۔ اردو اور بنگال
۷۔ مختصر تاریخ بنگلہ ادب (حصہ اول)
۸۔ " " " (حصہ دوم)
۹۔ آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو
۱۰۔ نامے جو میرے نام آئے
۱۱۔ بکھرے ورق (ترجمہ)
۱۲۔ تاریخ بنگلہ ادب (ترجمہ)
۱۳۔ بنگال میں اردو زبان و ادب (چند مضامین)
۱۴۔ پورن کمبھ (ترجمہ)

۱۵۔ آفتاب علم و ادب ڈاکٹر سونیتی کمار چیٹرجی
۱۶۔ غالب اور بنگال
۱۷۔ اقبال، ٹیگور اور نذرل،
تین شاعر — ایک مطالعہ

زیرِ طبع تصانیف

۱۔ جینو اکٹی مولیا چادر (بنگلہ میں اردو سے ترجمہ)
۲۔ اردو ادب اور بنگالی کلچر
۳۔ بنگال کے نامور مسلمان
۴۔ خواتین بنگال کی اردو خدمات
۵۔ تذکرہ تصانیف بنگالہ،



کسی ایک فنکار کا دوسرے سے مقابلہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ بعض لوگ اس طرح مقابلہ کرنے کو درست خیال نہیں کرتے کیونکہ ہر فنکار کی خوبیاں اور کمزوریاں اپنی اپنی ہوتی ہیں اور ایک کا دوسرے سے مقابلہ کرکے، کسی کو کسی سے بہتر یا کمتر قرار دینا ناانصافی یا زیادتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ خیال درست ہو۔ لیکن پھر بھی تقابلی مطالعہ ایک دلچسپ مشغلہ ہے اور اس سے ان فنکاروں کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ لیکن یہ تقابلی مطالعہ اگر ایک ہی زبان کے دو قلمکاروں کا ہو تو ایسا مطالعہ کرنا کسی قدر آسان ہے چونکہ ایک زبان کے فنکاروں میں بہت سی قدریں مشترک ہوتی ہیں لیکن اگر یہ مطالعہ ایک سے زیادہ زبانوں کے فنکاروں سے متعلق ہو تو بہت سی دشواریاں پیش آتی ہیں

اور ایسا تقابلی مطالعہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اُن زبانوں سے آگاہ ہو، اُن زبانوں کے ادبی ورثے، روایات اور تاریخِ ادب کے سلسلے میں ضروری معلومات رکھتا ہو، ورنہ وہ تقابلی مطالعہ مفید نہیں ہوتا۔

جدید ہندوستانی زبانوں کے ادب میں انیسویں صدی کے درمیانی زمانے سے نئی بیداری کا دور شروع ہوا ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ادبی طور پر ان زبانوں کی پیدائش کا عہد یہی ہے تو غالباً زیادہ بہتر ہوگا۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ سترہویں یا اٹھارہویں صدی میں دیسی زبانوں میں کوئی ادب نہیں تھا، تھا اور ضرور تھا، لیکن ہندوستانی سماج اور ساتھ ہی ادب میں نشاۃ ثانیہ کا عہد انیسویں صدی کے درمیانی دور سے شروع ہوتا ہے۔ قدیم تمدن کے بطن سے اسی دور میں کئی سماجی، مذہبی، اصلاحی اور سیاسی تحریکوں نے جنم لیا۔ جس سے نئے دور کی داغ بیل پڑی۔ دنیائے فکر و خیال میں جوار آیا، انقلاب آیا اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ادب چونکہ سماج اور سماجی زندگی کا بھرپور ترجمان ہے، اسلئے سماجی تاریخ کا بہترین آئینہ بھی ہے۔ قوموں کی بلندی و پستی اور ہر سماجی گروہ کا درست اندازہ

ادب کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے اور ہندوستانی زبانوں کا ادب بھی ہمارے سماج کا بھرپور ترجمان ہے۔

انیسویں (۱۹) صدی کے خاتمے پر، موجودہ دور کی فکری بلندی کو بروئے کار لانے میں جن تین فنکاروں نے اہم ترین حصہ لیا ہے وہ تینوں ہی انیسویں (۱۹) صدی کے آخری سالوں میں پیدا ہوئے اور تقریباً بیسویں (۲۰) صدی کی چوتھی دہائی تک اپنے افکار سے ہماری رہنمائی کرتے رہے۔ اِس دور کو بجا طور پر ہماری قومی بیداری کا دَور کہا جاتا ہے، جب ہمارا قومی شعور جاگا اور حصولِ آزادی کے لیے قومی جد و جہد کا آغاز ہوا۔ ہمارے تینوں شعراء یعنی سر محمد اقبالؔ، رابندر ناتھ ٹیگور اور قاضی نذر الاسلام اِس دَور کے نمائندہ فنکار ہیں۔ لہٰذا اِن تینوں فنکاروں کے افکار و خیالات کا ایک تقابلی مطالعہ ہر لحاظ سے نہ صرف اہم ہے بلکہ وقت کی ایک ضرورت بھی ہے۔ اسی خیال کے تحت میں اپنی سی کوشش کرتا ہوں۔

میں نے اقبالؔ کا نام سب سے پہلے لیا ہے، حالانکہ سنہ پیدائش کے لحاظ سے ٹیگورؔ کا نام پہلے آنا چاہیئے تھا۔ لیکن ہمارے سماج میں موت ہی سے اولیت کا شمار کیا جاتا ہے اور ہمارے تینوں شعراء میں اقبالؔ سب سے پہلے ۱۹۳۸ء میں ہم سے

جُدا ہو گئے۔ اسکے بعد ٹیگور (۱۹۴۱ء) اور حال ہی میں (۱۹۷۶ء) نذر الاسلام بھی چل بسے۔ اقبال ۲۲ر فروری ۱۸۷۳ء یا ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے اور ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ رابندر ناتھ ٹیگور ۷ر مئی ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے اور ۷ر اگست ۱۹۴۱ء کو جہانِ فانی سے کوچ کر گئے اور قاضی نذر الاسلام ۲۴ر مئی ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے اور ۲۹ر اگست ۱۹۷۶ء کو ہمیشہ کے لئے ہم سے جُدا ہو گئے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے تینوں شعراء آزادی (۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء) سے پہلے ہی چل بسے، تو یہ اِس لحاظ سے غلط نہ ہوگا چونکہ قاضی نذر الاسلام اگست ۱۹۴۲ء میں ایسے لاعلاج مرض میں مبتلا ہوئے کہ ہزار علاج معالجے کے باوجود پھر سے وہ ہمیں کوئی نغمہ سُنا نہ سکے ـــ بقول اقبال

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اور یہ ہماری خوش قسمتی ہی تھی کہ اِس عہد میں ہمارے "چمن" میں ایک نہیں بلکہ ایک ساتھ تین "دیدہ ور" سرگرم عمل رہے اور زندگی کے مختلف نشیب و فراز سے ہمیں آگاہ کرتے ہوئے ہماری رہنمائی کرتے رہے ہیں۔

ہمارے اِن تینوں قلمکاروں میں ایک کا (علامہ اقبالؔ) تعلق اُردو زبان سے اور دو (ٹیگور اور نذرلؔ) کا بنگلہ زبان سے رہا ہے۔ ایک (اقبالؔ) نے اپنی مادری زبان سے ہٹ کر اُردو و فارسی میں شعر کہے اور دیگر دونوں (ٹیگور اور نذرلؔ) نے اپنی مادری زبان کی خدمت کی۔ ہاں اقبالؔ اور ٹیگور نے انگریزی میں بھی چند مضامین لکھے ہیں لیکن نذرلؔ نے صرف بنگلہ ہی میں شاعری کی ہے۔

اقبالؔ ـــــ شاعر تھے، فلسفی تھے۔ اسکے علاوہ انگریزی و اردو میں چند نثری مضامین، خطوط اور تقاریر اُن کی یادگار رہیں۔ انھوں نے پروفیسری بھی کی، وکالت بھی اور زندگی کے آخری چند سالوں میں (۱۹۲۶ء سے) سیاست میں بھی عملی طور پر حصہ لیا۔

ٹیگور ـــــ نہ صرف شاعر تھے بلکہ انھوں نے کئی ناولوں، افسانوں، ڈراموں اور سفرناموں کے علاوہ سیکڑوں ادبی، تحقیقی، تنقیدی، سماجی، ثقافتی، تعلیمی، مذہبی، سائنسی، تاریخی، تہذیبی اور سیاسی مضامین لکھے۔ وہ گیت کار، گلوکار، موسیقار، اداکار، مصور یا نقاش بھی تھے اور صحافی بھی۔ عملی سیاست میں بھی انھوں نے کبھی کبھی حصہ لیا۔

نذرلؔ ـــــ صرف شاعر نہ تھے بلکہ گیت نویس، افسانہ نگار،

ناول نگار، ڈرامہ نگار، ایڈیٹر، صحافی، مضمون نگار اور مترجم سب ہی کچھ تھے۔ انھوں نے سیکڑوں گیت لکھے اور خود گائے اداکاری بھی کی، موسیقی سے ان کا گہرا لگاؤ تھا۔ نذرل نے گاؤں گاؤں گھوم کر کانگریس تحریک میں عملی طور پر سرگرم حصہ لیا۔ سیاسی میدان میں وہ مزدوروں، کسانوں، نوجوانوں اور آزادی کے لیے لڑنے والوں کے ساتھ رہے۔ اقبال اور ٹیگور سے نذرل میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ انھوں نے حکومتِ وقت کے خلاف ایسی بھیانک آگ لگائی کہ اُن کو اپنی تخلیقات کی بنا پر کئی بار جیل جانا پڑا، سزا بھگتنی پڑی اور اُن کی تصانیف کو حکومتِ وقت نے ضبط کر لیا۔ اُن کے اخبارات بند کر دیئے۔ اُن کی تحریروں پر ہر طرح سے سخت پابندی لگا دی گئی۔

اقبال، ٹیگور اور نذرل میں سب سے زیادہ ٹیگور نے لکھا ہے کہا جاتا ہے کہ اُن کی تصانیف کی تعداد تین سو سے بھی زائد ہیں۔ واقعی ٹیگور کی تخلیقات وقت طلب ہیں۔ اُن کے گیت اور کلام کم و بیش ۸۰ مجموعوں پر مشتمل ہے۔ ٹیگور کے ڈراموں کی تعداد ۳۸ ہیں، ناول ۱۳ ہیں اور افسانوں کے ۹ مجموعے ہیں۔ تقاریر، سفرناموں، خطوط اور دیگر مضامین کے مجموعوں کی

تعداد بھی سَو سے کم نہ ہوں گے۔ ٹیگور کا پہلا مجموعۂ کلام "کوی کہانی" (داستانِ شاعر) ۱۸۸۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔

نذر الاسلام کے گیت اور کلام کے مجموعے ۲۳ ہیں۔ افسانے کے مجموعے ۳، ناول ۳، اور ناٹک بھی ۳ ہیں۔ مقالات و مضامین کے پانچ مجموعے ہیں۔ روزنامہ "نوُ جگ" اور ہفت روزہ "دھوم کیتو" سے اُن کا تعلق رہا ہے۔ اسکے علاوہ انھوں نے خود "لانگل" نامی ایک ہفت روزہ اور "نوروز" کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا تھا۔ تراجم میں رباعیاتِ حافظ (سنہ ۱۹۳۰ء) منظوم پارۂ عم (سنہ ۱۹۳۳ء) اور رباعیاتِ عمر خیام (سنہ ۱۹۶۰ء) شامل ہیں۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں نذر الاسلام صاحبِ کتاب ہوئے جس سال اُن کی دو تصانیف "اگنی بینا" (نظمیں) اور "بیتھار دان" (افسانے) شائع ہوئے۔

اقبال نے سب سے کم لکھا ہے یعنی اُردو و فارسی میں صرف درجن بھر تصانیف کے وہ مالک ہیں۔ اقبال کی ایک انگریزی تصنیف Reconstruction of Religious Thought in Islam ہے جو سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ اُن کی پہلی تصنیف ہونے کا شرف "علم الاقتصاد" کو حاصل ہے جو اقتصادیات پر لکھی ہوئی اردو میں پہلی تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ اور جو کہ

سنہ ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔

ٹیگور، اقبال، اور نذرل کی تصانیف کا جو مختصر ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اُس کے مطابق سب سے قبل صاحبِ کتاب ہونے کا شرف ٹیگور (سنہ ۱۸۸۸ء) کو حاصل ہے۔ اس کے ۱۶ سال بعد (سنہ ۱۹۰۴ء) میں اقبال کی پہلی ایک مختصر تصنیف "علم الاقتصاد" منظرِ عام پر آئی۔ حالانکہ یہ نصابِ تعلیم کے لئے لکھی ہوئی کتاب تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اردو والوں نے اقبال کو بطور شاعر سنہ ۱۹۲۴ء میں جانا جب اُن کی مشہور تصنیف "بانگِ درا" شائع ہوئی۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ اردو کے علمی ادبی حلقہ میں اس سے قبل اقبال کا نام نہیں آیا۔ اقبال کو اردو والے اُن دنوں سے جاننے لگے تھے جب سنہ ۱۹۱۱ء میں انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں انھوں نے مشہور نظم "شکوہ" سنائی حالانکہ اُن کی پہلی نظم "نالۂ یتیم" کو انھوں نے اسی انجمن میں سنہ ۱۸۹۹ء ہی میں پیش کیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۲ء یعنی دو سال جب نذرالاسلام کا مشہور مجموعۂ کلام "اگنی بینا" منظرِ عام پر آیا اُس وقت تک اقبال کی تین فارسی تصانیف اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی اور پیامِ مشرق شائع ہو چکے تھے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ٹیگور کے بعد لوگ اقبال کو جاننے لگے تھے لیکن

اقبالؔ اور نذرلؔ کی شہرت کا زمانہ تقریباً ایک ہے یعنی ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ اور ۱۹۲۲ء سے کئی سال قبل ہی ٹیگور عالم گیر شہرت کے مالک بن چکے تھے چونکہ اُن کو "گیتانجلی" پر نوبل انعام ۱۹۱۳ء میں مل چکا تھا اور ۱۹۴۲ء تک ٹیگور اندازاً پچاس کتابوں کے مصنف ہو چکے تھے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے سب سے طویل عمر (۸۰ سال) پائی اور سب سے طویل عرصہ تک (۶۸ سال) زبان و ادب کی خدمت کی ہے اسکے بعد اقبالؔ آتے ہیں جو اندازاً چالیس سال تک ادبی میدان میں رہے۔ اور سب سے کم عرصہ نذرلؔ کے حصے میں آیا جن کو کوئی ۲۵ سال کا زمانہ (۱۹۱۷ء تا ۱۹۴۲ء) زبان و ادب کی خدمت کرنے کے لیے ملا ہے۔ لیکن بہ لحاظ تعدادِ تصانیف نذرلؔ کو سب سے کم مدت ملنے پر بھی دوسرا مقام حاصل ہے۔

اقبالؔ کا جنم بھوم سرزمین پنجاب ہے۔ پنجاب جو صرف پانچ دریاؤں کے لئے ہی مشہور نہیں ہے بلکہ جہاں کے مردِ بہادر کے لئے بھی جانے جاتے ہیں۔ پنجاب کی آب و ہوا صحت کے لئے مشہور ہے اور یہی وجہ ہے کہ عام طور پر پنجابی نہایت صحت مند، اونچے تگڑے ہوتے ہیں اور اقبالؔ بھی عام پنجابیوں کی طرح جسم اور صحت کے مالک تھے۔ بعض لکھنوی نازک مزاج

شعراء نے اسی بنا پر اقبال کو "پہلوان شاعر" تک کہا ہے
جسمانی طور پر ٹیگور بھی خوب صحتمند تھے اور عام بنگالیوں سے
کافی اونچے تگڑے جسم کے مالک تھے۔ عرصہ پچاس سال تک
وہ بالکل ہی صحت مند رہ کر انتھک ادبی خدمت انجام دیتے
رہے۔ صحت کے لحاظ سے اتنا ٹھہرا موقع نہ اقبال کو ملا اور نہ
ہی نذرل کو۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں جب ٹیگور کی عمر کوئی ۷۹ سال
کی تھی تب وہ سخت بیمار ہوئے اور اُسی سال "روگ
سجیّا" (بستر علالت) نامی اُن کا مجموعۂ کلام شائع ہوا۔
پنجاب کی سر زمین سے بنگال کی دھرتی زیادہ نرم اور
آبی ہے۔ یہاں کی نرم دھرتی رسیلی ہے۔ پنجاب پانچ دریاؤں
کا دیس ہے تو بنگال کا ہر گاؤں ندی، نالے، اور پوکھر
(تالاب) سے آباد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب اگر گیہوں
کے لئے مشہور رہے تو بنگال دھان اور پاٹ (پٹ سن)
کے لئے۔ میں پنجابی زبان سے تو آگاہ نہیں ہوں لیکن
عام خیال یہی ہے کہ بنگلہ زبان پنجابی کے مقابلے میں زیادہ
ملائمت اور شیریں ہے اور اسی لئے بنگلہ زبان "رس گلا"
کی زبان کہلاتی ہے۔ اقبال پنجابی زبان کے شاعر نہیں تھے
انھوں نے اردو فارسی کو (جو اُن کی تعلیمی زبانیں بھی رہی ہیں)

اپنے اظہارِ خیال کے لئے اپنایا۔ اور اُردو کو اس طرح گلے لگایا کہ یہی حقیقی معنوں میں اُن کی مادری زبان بن گئی۔ بنگلہ کی طرح پنجابی بھی ایک علاقائی زبان ہے اور اسی لیے اُس زبان میں بھی لوک گیت ہیں یا وہاں کے چند مخصوص لوک ناچ بھی ہیں۔ لیکن اُردو چونکہ پنجابی یا بنگلہ کی طرح کوئی علاقائی زبان نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی ضرورت کے مطابق تہذیبی ملن کے نتیجے میں پیدا شدہ تہذیبی زبان ہے اِسلیئے یہ کُل ہند زبان ہوتے ہوئے بھی کسی خاص اور محدود علاقے (حالانکہ مختلف علاقوں کی اُردو میں فرق بھی ہے) کی زبان نہیں بن پائی اور اِس میں لوک گیت نے جنم نہیں لیا اور نہ ہی کوئی مخصوص ناچ ہے جسے ہم اُردو لوک ناچ قرار دے سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو کے شعراء کا عموماً موسیقی و گیت سے لگاؤ نہیں ہوتا (یہاں اوزان شعر سے بحث نہیں)۔ اُردو میں ایسے شعراء بہت ہی کم ہیں (مثلاً واجد علی شاہ اختر یا حفیظ جالندھری) ——— جو شاعر ہونے کے ساتھ گیت کار، گلوکار اور موسیقار بھی ہیں۔ راگ راگنیوں کا علم رکھتے ہیں۔ لیکن بنگلہ زبان میں ایسے شعراء بہت ہیں اور عام طور پر یہاں کے لوگ گیت

کے متوالے ہیں۔ اقبالؔ کو کبھی گیت یا موسیقی سے کوئی لگاؤ نہیں رہا ہے۔ اِس میدان میں ہم صرف ٹیگور اور نذرلؔ ہی کو پاتے ہیں جن دونوں شعراء کا موسیقی سے گہرا لگاؤ رہا ہے اور انھوں نے سیکڑوں گیت لکھے اور خود گائے ہیں۔ بنگلہ سنگیت کی دنیا میں "رہندر سنگیت" (ٹیگور کے گیت) اور "نذرل گیتی" (نذرل کے گیت) مشہور و مقبول ہیں اور ہر روز کلکتہ اور ڈھاکہ ریڈیو سے بے شمار فنکار یہ گیت پیش کرتے ہیں۔ سنگیت کے سلسلے میں نذرلؔ، ٹیگور سے بھی آگے ہیں۔ ٹیگور نے صرف ہندو تہذیب و تمدن کے ہی گیت لکھے اور گائے ہیں لیکن نذرلؔ نے "اسلامی سنگیت" کے علاوہ "شیاما سنگیت" (شیاما۔ کالی دیوی کا ایک اور نام ہے) بھی سیکڑوں لکھے اور گائے ہیں یعنی نذرلؔ نے سنگیت میں ہندو مسلم دونوں مذاہب کی ترجمانی کی ہے۔ نذرالاسلام کے گیتوں کی مقبولیت کی وجہ سے کلکتہ ریڈیو میں اُن کو ملازمت (سنہ ۱۹۳۰ء) بھی ملی تھی اور انھوں نے نئی راگ راگنیوں پر کافی کام بھی کیا ہے۔ ٹیگور کے بعد بنگلہ سنگیت کو آگے بڑھانے میں نذرالاسلام نے سب سے بڑھ کر کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد عبداللہ

رقمطراز ہیں:- "

رابندر ناتھ ٹیگور کے گانوں کی تعداد تخمیناً
ڈھائی ہزار بتائی جاتی ہے۔ نذرالاسلام
اس سے بھی زیادہ گانوں کے خالق ہیں
مگر ان کی صحیح تعداد بتانا مشکل ہے۔ بعض
نے چھتیس سو (۳۶۰۰) بتائی ہے۔ بہر
حال یہاں تک یقین کے ساتھ کہا جا سکتا
ہے کہ انھوں نے تین ہزار سے بھی زیادہ
گانے لکھے ہیں " ۱ ؎

یعنی گیت وہ میدان ہے جہاں ہمارے تینوں شعراء میں سے بنگلہ زبان کے دونوں شعراء نے قدم رکھا اور اردو کے شاعر اقبال اس میدان سے دور رہے ہیں (اگر ہم اُن کے ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور ترانۂ ملی وغیرہ نظموں کو گیت نہ قرار دیں یا پھر بحث برائے بحث کے لئے یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری میں کی جان غزل ہے بذاتِ خود گیت ہے چونکہ غزل گائے بھی خوب جاتے ہیں اور ترنم سے پڑھ کر سنائے بھی جاتے ہیں اور یہ کہ شاعر نذرالاسلام نے بنگلہ زبان میں غزل گیتی کو بھی اپنایا ہے۔)

---

۱ ؎ نذرالاسلام — پروفیسر محمد عبداللہ صفحہ ۱۳۳

(۲)

رابندر ناتھ ٹیگور رئیس زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ذاتی زندگی میں اُن کو غربت، بھوک یا تنگ دستی کا کوئی تجربہ حاصل نہیں ہوا۔ اقبالؔ کا گھرانہ ٹیگور گھرانے کی طرح رئیس نہیں تھا لیکن اقبالؔ کو بھی غریب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اُن کا تعلق اُوپری متوسط طبقے سے تھا۔ ہمارے تینوں شعرا میں سب سے زیادہ دُکھ نذرلؔ ہی کے حصّے میں آیا ہے۔ بچپن ہی سے اُسے دُکھ درد اور بھوک و غربت نے پالا ہے اور انھیں نے برسوں غربت، بھوک فاقہ کشی اور تنگدستی کا ہر ہر قدم پر مردانہ وار مقابلہ کیا۔ ٹیگور اور اقبالؔ کے کلام میں ہمیں غربت و بھوک کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن اتنی کثرت اور شدت سے نہیں جتنا نذرلؔ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اُن دونوں کے بیان میں تجربے کی بُو، صداقت یا تاثر کی گہرائی نہیں ہے جو نذر الاسلام کے بیان کی جان ہے کیونکہ نذرلؔ کی آواز بناوٹی نہیں ہے۔

حالانکہ ٹیگور بڑے زمیندار تھے لیکن تاریخ ادب میں غالباً اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ کوئی نہیں ہے کہ خود زمیندار ہوتے ہوئے بھی ٹیگور نے کھل کر کسانوں کی طرفداری کی

کی اور زمینداروں کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی یعنی خود اپنے طبقے کے خلاف بغاوت کی، اپنے ذاتی مفاد کے خلاف قدم اٹھایا۔ ٹیگور کو اپنی زمینداری کی دیکھ بھال کا کام بھی کچھ عرصہ تک خود کرنا پڑا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب وہ کسانوں سے قریب ہوئے اور کسانوں کے دکھ درد کو جاننے کا انھیں موقع ملا۔ ٹیگور کی مشہور نظم "دو بیگھہ زمین" اس سلسلے میں خاص کر قابل غور ہے۔ کئی پہلوؤں سے یہ نظم ادب میں ایک نئے عہد کا علم بردار ہے۔ ٹیگور نے یہ نظم بنگلہ ۱۳۰۲ یعنی ۱۸۹۶ء میں لکھی۔ اس نظم میں دکھایا گیا ہے کہ کیونکر ایک ظالم زمیندار، ایک غریب کسان جس کی صرف دو بیگھہ زمین ہی ہے کو بھی، اس پر جھوٹا مقدمہ دائر کر کے بالکل مفت، محض اپنے باغ کو چوکونا بنانے کے شوق میں چھین لیتا ہے اور کسان مجبوراً باپ دادا کی امانت اس زمین کو چھوڑ کر سادھو کے بھیس میں گاؤں سے نکل جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شاعر ٹیگور کا یہ شعر جو وہ سرمایہ داروں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔

"ہائے رے دُنیا

اِس دنیا میں وہی اور زیادہ دولت کا طالب ہے
جس کے پاس پہلے ہی سے ڈھیر کا ڈھیر پڑا ہوا ہے۔!
راجا کا ہاتھ ہی وہ ہاتھ ہے

جو تمام
غریبوں کی پونجی بھی ہڑپ کر لیتا ہے،
چُرا لیتا ہے۔"

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ٹیگور کا خیال تھا (اور اِس خیال کا اظہار انھوں نے ۱۹۰۶ء میں کیا۔ جب ہمارے ملک کے سیاسی رہنماؤں میں بھی یہ سوجھ بوجھ نہیں تھی) کہ جب تک کسانوں کو عوامی تحریک میں شامل نہ کیا جا سکے تب تک ہندوستانی میں جنگِ آزادی جیتی نہیں جا سکتی چونکہ ہندوستان اپنے گاؤں میں آباد ہے۔ سودیشی تحریک کے زمانے میں جب چند سیاسی رہنماؤں کو کسانوں کا خیال آیا اور وہ کسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور سودیشی تحریک میں اُن کو شامل کرنے کے لئے گاؤں گاؤں جانے لگے، تب ٹیگور نے ایسے رہنماؤں سے مخاطب ہو کر لکھا۔

"آج شہر کے انگریزی پڑھے ہوئے کچھ
لوگ، جب اَن پڑھ دیہاتی لوگوں کے

پاس جاکر اُن سے کہتے ہیں کہ "ہم سب بھائی بھائی ہیں۔" تب وہ سیدھے سادھے لوگ لفظ "بھائی" کا مفہوم سمجھ نہیں پاتے جن لوگوں کو ہم جاہل کسان کہہ کر جانتے ہیں، جن کے سکھ دکھ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم نے کبھی جن کی پروا نہیں کی، جن کی حالت کو جاننے کے لئے ہم حکومت کے شائع شدہ اعداد و شمار پڑھتے رہے، آج اچانک انگریزوں کے خلاف کمر باندھنے کے سلسلے میں اُن کو "بھائی" کہہ کر، اُن سے رشتہ جوڑیں تو فطرتاً اُن کو ہم پر شک و شبہ ہوگا۔ اور شک ہوا بھی ہے۔ ایک نامور سودیشی رہنما کی زبانی سُنا کہ جب وہ مشرقی بنگال کے مسلمان کسانوں میں تقریر کر رہے تھے تو اُن کی تقریر سن کر وہ کسان آپس میں کہنے لگے ـــــ "بابو لوگوں پر شاید کوئی مشکل آن پڑی ہے ـــــ"

کسانوں نے ٹھیک ہی سمجھا۔ اپنا مطلب حاصل

کرنے کے لئے اگر دوستی کا رشتہ کرنے
جائیں تب شک تو ہوگا ہی۔ چاہے مقصد
کتنا ہی عظیم ہو۔ چاہے اُس کا نام بیکاٹ،
"سوراج" یا "ملک کی ترقی" یا کچھ اور ہی
کیوں نہ ہو .... کسی دیہات
کے درمیان بیٹھ کر، جیسے کسی نے کبھی اُٹھا کر
بات تک نہ کی، اُسے علم دو، آگاہ کرو،
خوشی دو، اُمید دلاؤ، اُس کی خدمت کرو،
سیوا کرو، اُسے محسوس ہونے دو کہ وہ بھی
انسان ہے، اُسکی بھی اہمیت ہے۔ اِس دنیا
میں وہ بے کار محض نہیں ہے۔ لاعلمی نے
اُسے اپنے سائے سے بھی خوفزدہ کر رکھا ہے
تمام خوف سے اُسے نجات دلا کر اُس کے
دل میں ہمت لے آؤ۔ اُسے ناانصافی سے،
ظلم سے، زیادتی سے، اندھیرے سے بچاؤ،
جن کی بھلائی کے لئے تم نے کمر باندھی ہے
ہر روز اُن کے قریب قریب تر ہوتے رہو،
ایک ایک قدم کر کے کامیابی کی طرف آگے

بڑھو، میری یہی آرزو ہے کہ ملک کے ایک
ایک کونے میں، ایک ایک ایسا خادم بیٹھ
کر اپنی تمام عمر دے کر، کسی ایک کام
کو پورا کرنے لگ جائے ——"

(کلیاتِ ٹیگور جلد نمبر ۱ صفحہ ۳۲۲ — ۶۲۴)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی ادب میں ٹیگور کی آواز وہ پہلی صدا رہی ہے جس نے بھوکے، ننگے، غریب عوام کی طرف لوگوں کو دیکھنے پر مجبور کیا۔ ٹیگور سے قبل بھی ایسی آوازیں ادب میں کہیں کہیں ملتی ضرور ہیں لیکن صاف طور پر نہیں۔ ٹیگور کی مشہور نظم "اے بار پھراؤ مورے" (اب مجھے لوٹا دو) جو بنگلہ ۱۳۰۰ سن یعنی ۱۸۹۴ء کی تخلیق ہے اس سلسلے میں خاص کر قابلِ غور ہے ملک کے رہنماؤں اور دانشوروں کی نظروں کو ٹیگور ہی نے سب سے پہلے اس طرف پھیرا ہے۔ اس طویل نظم کے چند اشعار کا ترجمہ پیش کرتا ہوں ——

وہ ——
جو سر جھکائے سامنے کھڑے ہیں
اُن اُداس چہروں پر —— تحریر ہے
صدیوں کے ظلم و ستم کی، دکھ درد کی کہانیاں!

جب تک
اُن کے لاغر بدن میں سانس ہے
تب تک
وہ بوجھ اُٹھائے چلتے ہیں۔
اور اسکے بعد
نسل در نسل
اولاد کو یہ بوجھ ورثے میں دے جاتے ہیں۔!!
قسمت کو نہیں کوستے
کیکوان کو بُرا نہیں کہتے
انسان پر الزام نہیں دھرتے
وہ کسی پر ناراض نہیں ہوتے۔

کسی طرح محنت مشقت سے، چند دانے بچائے رکھتے ہیں
اور جب
کوئی اُن دانوں کو بھی چھین لیتا ہے۔
کوئی ظالم اُن کے دکھی دل پر وار کرتا ہے
تب وہ بیچارے
یہ بھی نہیں جانتے ـــــــــ کہ

انصاف کے لئے
کس در پر جائیں، کس کے در کھٹکھٹائیں
صرف طویل سانس چھوڑ کر پکارتے ہیں۔
"بھگوان، غریبوں کا بھگوان —" !

اور —
خاموش موت کو گلے لگا لیتے ہیں

اِن سب
خاموش بے زبان، اُداس چہروں کو
زندگی دینی ہوگی۔
اِن سب
مرجھائے ہوئے، ٹوٹے ہوئے دلوں میں
اُمید کی شمع جلانی ہوگی۔
للکار کر کہنا ہوگا
"لمحہ بھر کے لئے
سر اٹھا کر، ایک ساتھ کھڑے ہو جاؤ
تم جن سے ڈرتے ہو
وہ ظالم

تم سے زیادہ کمزور ہیں۔
جب تم جاگو گے، بیدار ہو جاؤ گے، ایک ہو جاؤ گے
تب وہ
بھاگ جائیں گے، جھک جائیں گے
وہ سب
کتّوں کی طرح دُم دبا کر بھاگ جائیں گے۔"

اِس دُنیا میں اب رکھا ہی کیا ہے ــ؟
دُکھ درد، آہ و فریاد
تاریکی ہی تاریکی، مفلسی و کمزوری۔
اِس کے بدلے
روٹی چاہیئے، زندگی چاہیئے، روشنی چاہیئے، کھلی فضا چاہیئے
قوت چاہیئے، صحت چاہیئے، چاہیئے مسرت سے پُر اُجالا
اور چاہیئے ــــ
ہمت و یقین سے بھرپور دِل

شاعر ــــ
غریبوں کی دنیا میں

تم صرف ایک بار لے آؤ

جنت سے یقین کی بھرپور پُر نور تصویر۔"

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی زبانوں کے ادب میں ۱۹۴۷ء سے پہلے ایسے واضح الفاظ میں کسی نے بھی غربت بھوک، اور افلاس کے ماروں، محنت کشوں کی عکاسی نہیں کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیگور کی یہ نظم ایک طویل عرصہ تک آزادی کی جد وجہد میں حصہ لینے والے بنگالی نوجوانوں کے دلوں کو گرماتا رہا اور وہ اِس نظم کو گنگناتے، گاتے پھرتے رہے ہیں اِس نظم کی کئی خوبیاں ہیں۔ غریبوں سے ہمدردی کا بھرپور جذبہ ہے، ایک حقیقی تصویر ہے۔ بھوک و افلاس کا — لیکن یہاں غریبوں کو ناداں، ناسمجھ، معصوم اور نہایت ہی کمزور کہا گیا ہے۔ اُن کی ایسی تصویر کھینچی گئی ہے کہ وہ خود کچھ نہیں کر پاتے، لب کھول نہیں سکتے حتیٰ کہ بھگوان سے شکایت تک نہیں کرتے۔ اُس وقت تک جب تک کوئی اُنا کی طرفداری نہ کرے، اُن کے دلوں میں ہمت کے جوت نہ جگائے، جد و جہد کا جذبہ اُن میں پروان نہ چڑھائے — شاعر نے یہاں صرف شاعروں سے، دانشوروں سے غریبوں کی مدد کرنے اور اُن کا ساتھ دینے کے لئے اپیل کی ہے اور پھر

ٹیگور کا لب و لہجہ انقلابی نہیں، باغیانہ نہیں۔ شیریں ہے، بھرپور شاعرانہ ہے ـــــ اسکے باوجود چونکہ یہ پہلی آواز ہے اسلئے اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ شری نیپال مجومدار نے اس نظم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے[1] ـــــ "ٹیگور کی زندگی میں یہ combative ness جنگ جو جذبہ، یہ جدو جہد کا جذبہ نہایت ہی وقتی ہے، عارضی ہے۔ بعد کی زندگی میں بھی کبھی کبھی ایسے جذبات نے انگڑائی لینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن میدانِ عمل میں، عملی جدوجہد میں خود نہیں اُترے، شامل نہیں ہو سکے۔"

یہ کہا جا چکا ہے کہ اقبال بھی غریب نہیں تھے۔ تاریخ کی روشنی میں ٹیگور سے اس سلسلے میں اقبال کے حالات بھی ملتے جلتے ہیں۔ اُن کے یہاں بھی غربت، بھوک اور افلاس کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن عملی طور پر وہ بھی کسانوں اور مزدوروں سے خود دُور رہے ہیں۔ ہمیں اقبال کی کوئی ایسی طویل نظم نہیں ملتی جس میں انھوں نے غریبوں کی زندگی کی بھرپور تصویر کھینچی ہو۔ ٹیگور کی طرح اقبال نے بھی کبھی محنت کشوں پر نظر ڈالی ہے۔ اُن کی حالت کو دیکھ کر وقتی طور پر جو احساس جاگا،

---

[1] ہندوستانی قومیت اور بین الاقوامیت اور ٹیگور (بنگلہ تصنیف) حصہ اوّل از شری نیپال مجومدار ص ۹۱۔

ہمدردی کا جو جذبہ پیدا ہوا۔ اُسی کے تحت انھوں نے محنت کشوں کو آگے بڑھ کر اِس سماج کو بدل دینے کے لئے للکارا ہے۔ ٹیگور کی آواز میں جو نرمی ہے وہ اقبالؔ میں نہیں بلکہ اقبالؔ کے جذبات میں شدّت زیادہ ہے اور وہ انقلاب کے لئے اُن کو کمر باندھ لینے کیلئے بھی کبھی کبھی کہتے ہیں۔ حالانکہ دہقانوں اور مزدوروں کے سلسلے میں انھوں نے صرف چند ہی اشعار کہے ہیں، لیکن جو چند اشعار کلام اقبالؔ میں اِس سلسلے میں پائے جاتے ہیں وہ وقتی یا عارضی ہی کیوں نہ ہوں، اُن کے انقلابی جذبات کی بھرپور نمائندگی کے لئے کافی ہیں۔ چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

پنجاب کے دہقانوں سے مخاطب ہو کر اقبالؔ کہتے ہیں:۔

بتا کیا تری زندگی کا ہے راز
ہزاروں برس سے ہے تُو خاک باز

اِسی خاک میں دب گئی تیری آگ
سحر کی اذاں ہو گئی، اب تو جاگ

بتانِ نسب و قبائل کو توڑ
رسوم کہن کے سلاسل کو توڑ

کسانوں اور مزدوروں کے حالات کا نقشہ کھینچنے کے بعد اقبالؔ اُن کو انقلاب برپا کرنے کے لئے للکارتے ہیں:۔

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
تُو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

معلوم کیسے ہند کی تقدیر کہ اب تک ، بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ ، بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
جاں بھی ہے گروِ غیر، بدن بھی ہے گروِ غیر ، افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو ، کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی ، اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

—— اور پھر نعرۂ انقلاب دیکھئے :-

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاں خراب
انقلاب
انقلاب ، اے انقلاب —!!

جیسا کہ کہہ چکا ہوں نذرالاسلام کے حالاتِ زندگی سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اُن کی زندگی کے زیادہ تر دن غربت میں کٹے ہیں اور عملی زندگی میں بھی اُن کا تعلق کسانوں اور مزدوروں سے گہرا رہا ہے وہ کسان تحریک کے ایک رہنما رہے ہیں اور عرصہ تک "لانگل" (ہل) کے نام سے ایک ہفتہ روزہ

بھی خود ہی نکالتے رہے ہیں۔ لہٰذا ہم نذر الاسلام کے کلام میں بار بار اور جگہ جگہ غربت، بھوک اور افلاس کے تقاضے پاتے ہیں۔ اُن کا نعرہ ایک جہاد ہے، انقلاب ہے، بغاوت ہے، طوفان ہے، اُن کے ترانے شعلے ہی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

اے افلاس، تُو نے ہی مجھے یہ عزت بخشی ہے
عیسیٰ کے سر پر
کانٹوں کا تاج کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے
مرحبا، اسی زینت سے تُو نے مجھے بھی سرفراز کیا
اور جواں مردی عطا کی
جو نورِ حقیقی کی پروردہ ہے۔
میری نگاہ کو تو نے آتش فگن ـــ اور
میری زبان کو تُند خو بنایا۔
اور یہ تیری ہی تربیت کا اثر ہے ـــ کہ
میرا نغمہ اُبھی تلوار سے زیادہ تیکھا ہو گیا

افلاس! تیرے آئین میں صرف ایک سزا ہے
تباہی اور بس ـــ!
تہذیبِ تصوف کو تُو پیروں تلے روندتا ہے

شرم و حیا کے نام سے کبھی تو واقف نہیں
رقص عُریاں تیرا محبوب شغل ہے
جو بھی سر بلند ہوا، تیرے ایک اشارے پر فنا ہو گیا
بہت سے دیوانے
تیرا ارشاد بجا کر ہنستے ہنستے پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں
بھوک کے ایندھن سے
موت کی آگ کو سُلگا کر تو کتنا مسرور ہوتا ہے
(افلاس سے خطاب)

"اگر وہ بیمار اور نحیف ہے
اگر نادار اور مفلس ہے، تو کیا ہوا۔؟
دنیا کے تمام عبادت خانے
اس پیکرِ خاکی سے زیادہ مقدس نہیں ہو سکتے۔!

کسان کے نام پر
ناک بھوں کیوں چڑھاتے ہو
پوچھو تو، وہی اس دنیا کا سرتاج ہے
(انسان)
کیا دنیا میں غریب ہمیشہ یوں ہی ذلیل ہوتے رہینگے۔؟

جو مزدور
اپنے گوشت پوست کے ایندھن سے ریل چلاتا ہے
وہ تو خود پٹریوں پر پڑا ہوا ہے
ریل پر تو بڑے لوگ بیٹھے ہیں۔
کیا کہا ـــــ "تنخواہ دیتے ہو" ـــ
منافقو! کہتے شرم نہیں آتی
مزدور کو چند پیسے دے کر تم نے دولت کے انبار لگالئے ہیں
(مزدور)

ہتھوڑی اور کدال سے
جو آسمان بوس پہاڑوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے
راستوں کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں
تمہاری خدمت کے لئے
جس نے قلی اور مزدور کا پیشہ اختیار کیا ہے
تمہاری باربرداری کے لئے
جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے
وہی، صرف وہی مزدور۔
ـــــ مکمل انسان ہے ـــ!
(نعرۂ انقلاب)

(۳)

قومی اور سیاسی شعور کو بلند کرنے، انگریزوں کے ہر چال کو اُلجھانے، سامراجیت کے ناپاک منصوبوں سے عوام کو آگاہ کرنے اور غلامی سے نجات پانے، آزادی کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دینے کے لئے ہندوستانی عوام کو تیار کرنے میں جدید ہندوستانی زبانوں کے بے شمار قلمکاروں نے حصّہ لیا ہے۔

قومی شعور کو بیدار کرنے میں جن ہندوستانی اہلِ قلم نے سب سے پہلے ملک کو تیار کیا، ان میں اولیت کا تاج بھی ٹیگور کے سر ہے۔ اقبال اور نذرالاسلام اِس میدان میں ٹیگور سے اندازاً تیس ۳۰ سال بعد آئے ہیں۔ صرف شعراء کا ذکر کیا، ٹیگور نے ہندوستانیوں کے دل میں اُس وقت انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبے کو بیدار کرنے کے لئے قلم اٹھایا تھا جب اِس ملک کے سیاسی رہنما بھی انگریز کی غلامی ہی کو ہندوستان کے لئے ترقی کا واحد راستہ تصوّر کرتے تھے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جدوجہد آزادی کے ایسے کئی رہنما جو آج مشہور و مقبول ہیں بلکہ قومی ہیرو تصوّر کئے جاتے ہیں۔

اُن تمام کا اُس وقت تک، دُور دُور نام و نشان نہیں تھا سیاست سے اُن کا کوئی لگاؤ نہیں تھا حتیٰ کہ مہاتما گاندھی نے بھی سیاسی میدان میں قدم نہیں رکھا تھا اور جن کو ہم کانگریس کے ابتدائی رہنما کہتے ہیں وہ بھی انگریزوں کے طرفدار ہی تھے۔ اُن کی جد و جہد کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ انگریزوں کے تحت رہ کر باعزت اعلیٰ سرکاری ملازمت حاصل کریں۔ وہ انگریزی کا تعلیم یافتہ لوگ اپنے لئے بہتر سرکاری ملازمت کے خواہاں تھے اور بس۔

بعض نقادانِ ادب نے ٹیگور کو یہ کہہ کر بدنام کیا ہے کہ وہ "بڑے گھر کے لاڈلے" تھے۔ ایسے نقاد یہ بھول جاتے ہیں کہ تنقید کے لئے بنیادی ضرورت حالاتِ زمانہ کا خیال رکھنا ہے۔ تاریخی پس منظر اور سماجی حالات کا اگر علم نہ ہو تو نقاد کی بات تنقیدی اصولوں کے خلاف ہی ہو گی۔ ٹیگور کو بھی جن نقادوں نے "بڑے گھر کا لاڈلہ" قرار دیا ہے اُن کی نظر اُس سماج اور وقت کے حالات پر نہیں رہی ہے جس کی وجہ سے وہ انصاف نہیں کر پائے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں جتنے ناموَر لوگوں کے نام ہم قومی رہنماؤں کے صف میں پاتے ہیں۔

وہ سب کے سب رئیس گھرانوں یا کم از کم اچھے کھاتے پیتے گھرانوں کے فرد رہے ہیں۔ مثلاً اُومیش چندر بنرجی، ستیا دراتھیا، دادا بھائی نوروجی، مہاتما گاندھی، سر سید احمد خاں، موتی لال نہرو سے لے کر محمد علی جناح اور پنڈت جواہر لال نہرو تک۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کا تعلق آج کے سیاسی نقطۂ نظر کے مطابق "بورژوا" طبقہ سے نہ ہو۔ اور اگر اس نقطۂ نظر سے پرکھا جائے تو ہمارے ان تینوں شعراء میں صرف نذر الاسلام ہی ہیں جن کو "بورژوا طبقہ" کا فرد قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ٹیگور پہلی بار ستمبر ۱۸۷۸ء میں ولایت گئے جب وہ ۱۷ برس کے تھے۔ اور فروری ۱۸۸۰ء میں لوٹے۔ اُس پہلے سفر ہی سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ ولائتی سماج کی کئی باتیں انھیں پسند آئیں۔ لیکن یورپ کی سیاست کو وہ قبول نہ کر سکے۔ اقوامِ یورپ کس بربریت سے دیگر ممالک کو لوٹتے رہے تجارت کے نام پر انگریز ظلم و جبر سے، جنگ و جدل سے، نہایت بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیگر ممالک کو لوٹتے اور محکوم بناتے رہے ہیں۔ ایسے اقدامات نے ٹیگور کے دِل میں انگریزوں اور دیگر سامراجی طاقتوں سے شدید نفرت پیدا کر دیا

حالانکہ ٹیگور نہ سیاست داں تھے اور نہ سماجی یا اصلاحی رہنما بلکہ بنیادی طور پر وہ صرف شاعر تھے۔ لیکن فنکار ظلم کے خلاف آواز بلند کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اُن دنوں ٹیگور کی عمر ہی کیا تھی۔ رومانس کے دن تھے، ہنسنے کھیلنے کا زمانہ تھا لیکن ٹیگور نے اُس زمانے میں بھی ایسے مضامین نظم و نثر لکھے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

یورپی سامراج کس طرح چین میں تجارت کے نام پر ظلم کر رہا تھا۔ اُس کی ایک بھیانک تصویر ٹیگور نے "چین میں موت کی تجارت" نامی مقالے میں ۱۸۸۱ء میں کھینچا۔ انگریزوں پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :-

"ایک پورے قوم کو، دولت کی لالچ میں
کس طرح زہر پلایا گیا، ایسا بھیانک،
بے رحم، بات کبھی سُنی تک نہیں گئی۔ چین
نے رو رو کر کہا ——— "میں افیون نہیں
کھاؤں گا ——— انگریز تاجر نے کہا ———
"ایسا کیسے ہوسکتا ہے ———؟" پھر چین کا
دونوں ہاتھ باندھ کر، اُس کے منھ میں کمان
کے ذریعہ ٹھوس ٹھوس کر افیون کھلایا

گیا ـــ اور پھر کہا ـــ "جو افیون کھائے ہوا اُسکی قیمت دو، دام دو ـــ ایک زمانے سے انگریز چین میں یہ عجیب و غریب تجارت چلا رہے تھے ...... رفتہ رفتہ دیکھا گیا کہ یورپ کے باہر دیگر تمام ممالک میں یورپی تہذیب، روشنی یا اُجالا کے لیئے نہیں بلکہ آگ لگانے کے لیئے روشن کیا گیا ہے۔ اسی لیئے ایک دن کمان سے گولے اور افیون کے پنڈ دونوں ایک ساتھ چین پر پھینکے گئے۔ آج تک تاریخ میں اتنا بھیانک بربادی کا کھیل کبھی کھیلا نہیں گیا ہے ـــ"

اسکے برسوں بعد سامراجی تجارت کے سلسلے میں اقبال نے بھی کہا:-

رعنائی تعمیر میں، رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیئے مرگِ مفاجات

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے ...... ، ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

۱۸۸۵ء تاریخ ہند میں ایک اہم ترین سال ہے۔ اسی سال کانگریس نے جنم لیا۔ لیکن اُن دنوں کانگریس کا مقصد نہ سامراجیت کی مخالفت تھی، نہ ہندوستان کی آزادی بلکہ کانگریس وہ پلاٹ فارم تھا جس پلاٹ فارم سے "نیم انگریز ہندوستانی" یعنی انگریزی اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے چند ہندوستانی انگریزوں کی تعریف اور خوشامد کرتے ہوئے اُن سے اپنے لیے اونچے سرکاری عہدوں کی بھیک مانگتے تھے اور بس۔ کم از کم ابتدائی ۸، ۱۰ سالوں تک کانگریس کے اس نظریہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کانگریس میں زیادہ تر ہندو تھے اور سر سید احمد خان اسکے خلاف تھے کہ مسلمان اس کانگریس میں شامل ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سر سید احمد خان نے انگریزوں کے خلاف ملک کی آزادی کے لئے کوئی الگ راہ نکالی تھی۔ وہ بھی انگریزوں کے دوست تھے۔ لیکن اُن کا خیال یہ تھا کہ کانگریس سے الگ رہ کر ہی وہ مسلمانوں کے لئے انگریزوں سے زیادہ سہولتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں اُن کو کچھ کامیابی بھی ہوئی تھی خاص کر اُن دنوں جب کانگریس میں کچھ طاقت آئی اور حکومتِ وقت نے یہ محسوس کیا کہ اگر یہ کانگریس جو اب صرف اپیل کرتی ہے، گزارش کرتی ہے؛ اگر اس طرح پھیلتی گئی اور زور

سے زیادہ لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تو آئندہ چل کر کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ لہذا اگر مسلمانوں کو "کچھ دے کر" ہندوؤں سے الگ رکھا جائے تو اُن کے حق میں مفید بھی ہوگا دوسری بات یہ ہے کہ ہندوؤں اور خاص کر بنگالیوں نے انگریزی تعلیم پہلے پائی تھی چونکہ انگریزوں کے قدم بنگال ہی میں جمے تھے۔ بہر حال چونکہ اس مضمون میں قومی جد و جہد کی تاریخ پر روشنی ڈالنا نہیں ہے اور نہ ہی یہاں ٹیگور کے سیاسی افکار و خیالات پر مفصل بحث مقصود ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ٹیگور نے بھی کانگریس کے چند ابتدائی اجلاسوں میں حصہ لیا تھا حالانکہ اُن کے پاس اعلیٰ انگریزی تعلیم کی کوئی سند نہیں تھی اور نہ ہی اُن کو ملازمت سے کوئی سروکار تھا۔ اگر کانگریس سے ٹیگور کے تعلقات پر غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ کانگریس میں وطن یا قوم پرستی کے جذبات کو ٹیگور نے پروان چڑھایا ہے اِس لئے ٹیگور کے کلام اور مضامین سے دو تین مختصر اقتباسات اِس سلسلے میں پیش کرتا ہوں[1]

کانگریس کے اُس ابتدائی دور میں کلکتہ ٹاؤن ہال کے ایک

---

[1] اس سلسلے میں ایک قابلِ قدر تحقیق ڈاکٹر سچین سین کی "Political Philosophy of Rabindranath

جلسہ (بنگلہ سنہ ۱۲۹۰ء مطابق سنہ ۱۸۸۲ء) کا ذکر کرتے ہوئے "ٹاؤن ہال میں تماشہ" کے عنوان سے ٹیگور نے لکھا ــــ

" اُس دن ٹاؤن ہال میں ایک بہت بڑا تماشہ ہوا۔ دو تین انگریز اُمید کی ڈگڈگی بجا رہے تھے اور اس اُمید کی ڈگڈگی سے خوش ہو کر اس ملک کے کئی بڑے بڑے لوگ سر پر بڑی بڑی پگڑیاں باندھے ناچ رہے تھے۔ جو لوگ ہمارے ملک کی بے عزتی کرتے ہیں، ملک کا کوئی باوقار فرزند اُن لوگوں سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا۔ صرف ذرا سی سہولت کی اُمید پر جو لوگ بتیسی کھول کر اُن سے رشتہ کرنے جاتے ہیں، ایسے لوگوں کو دیکھ کر بھی نفرت اُبھر آتی ہے ـــ"

ٹیگور کے کئی مجموعہ کلام میں اُن کی سیاسی نظمیں شامل ہیں اس عہد کی بعض سیاسی نظمیں 'چیتالی' (۱۸۹۵ء) میں ہیں جن کا تعلق کانگریس کے ابتدائی دور سے ہے۔ ملاحظہ ہو اہلِ وطن سے مخاطب ہو کر شاعر کہتا ہے:

اے ماں
تو ممتا کو بالائے طاق رکھ کر
اپنے بچوں کو آزاد کر دے
بچوں کو پیار سے دامن میں لئے نہ رہ
اُن کو غربت کے خلاف لڑنے دے
یہ بچے۔
صرف اپنی ذات کے لئے نہیں ہیں ـــ بلکہ
وہ سارے جہاں کے لئے ہیں۔
اے ماں
تیری اولاد
محض تیری جائداد نہیں ہے

(رسنہا گراس)

اے مادرِ وطن
تو اپنے بچوں کو
بُرے بھلے سے، پاپ پُن سے مقابلہ کرنے دے
سکھ دکھ جھیلنے دے
ہر آفت کا مقابلہ کرنے دے ـــ اور اِس طرح
انسان بننے دے،

لاڈلے، بچوں کی طرح
اُن کو ہر ہر قدم پر
یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، کی نصیحت کر کے
قدم قدم پر ٹوک کر
معصوم بچوں کی طرح، اپنی گود میں نہ رکھا۔!
جان کی قربانی دے کر
دکھ درد کا مقابلہ کر کے
خود اپنے ہاتھوں سے ___ اُن کو
حالات کا مقابلہ کرنے دے
جدوجہد کرنے دے ___"
(شنگ ماتا)

اُس عہد کے کانگریسی رہنماؤں کے سلسلے میں نظم "اچھی ماں" میں کہتے ہیں:۔

"اے دوست
کس کی شکایت کروں، کس پر الزام دھروں
غصہ کرنا بیکار ہے۔
افسوس کرنا بیکار ہے ___ کیونکہ
جو حسرت روتے ہیں

جان نچھاور نہیں کرتے
ایسوں کی —
کون عزت کر سکتا ہے ؟

وہ (انگریز) جو دن رات تمہاری بے عزتی کرتے ہیں
تم ہو — کہ
اُن ہی کے پاس اپنی درخواست لے جاتے ہو
ارے ! اگر خود اپنے ہاتھوں سے انصاف نہیں کر سکتے
اگر بے عزتی کے باوجود
تم اُن سے ہی رشتہ جوڑتے ہو۔
تو پھر —
اپنے گھر کے کونے میں
سر جھکائے ، چُپ بیٹھے رہو —"

انیسویں صدی کے آخر میں دو دو بار قحط (۱۸۹۷ء اور ۱۸۹۹ء) پلیگ اور کالرا جیسی بیماریاں اور پھر زلزلہ سے ہزاروں لوگ موت کے منہ میں چلے گئے۔ عوام کا دکھ درد دیکھ کر شاعر کا دل رونے لگا۔ ملک کی خدمت اور ساتھ ہی جذبۂ آزادی نے پھر انگڑائی لی۔ مجموعہ کلام "نئی بدھیا"

(۱۹۰۰ - ۱۹۰۷ء) کی کئی نظموں میں ٹیگور کے اِس دور کے خیالات دیکھئے :-

" مجھے، اب خیالی دنیا میں قید نہ رکھو
بلکہ ــــ میدانِ عمل میں کودنے کے لئے
آزاد کردو ــــ "
(نظم نمبر ۴۷)

اے مالک
تم جس کے دِل میں ہو
اُسے شاہی عتاب کا کیا خوف
وہ تو
قید خانہ میں بھی آزاد ہے
جو امر ہے
اُسے موت کا کیا ڈر ــــ ؟
(نظم نمبر ۵۴)

انیسویں صدی کے آخر میں جو رجحانات اُبھرے اُن میں ایک
اہم رجحان قومیت کا تصوّر ہے۔ ہندوستان کے قومی تصوّر
ابتدائی عہد میں اُس میں مذہبی میلانات کارفرما رہی ہیں

لیکن ٹیگور میں یہ مذہبی تنگ نظری پائی نہیں جاتی۔ یورپی نظریہ قومیت کے ٹیگور[1] بھی اقبال کی طرح سخت مخالف رہے لیکن اقبال کی قومیت نے بعد میں ملت، یعنی ملت اسلامی کا روپ لے لیا اور ٹیگور نے قومیت کے لئے مذہب کو ضروری نہیں سمجھا۔ ٹیگور کی قومیت در حقیقت عالم گیر انسانیت ہے۔ ٹیگور کہتے ہیں:-

"دنیا کے انسان، رنگ و نسل، زبان، اخلاق، رسم و رواج اور مذہب کے اعتبار سے مختلف، جدا جدا یا رنگا رنگ ہیں۔ انسانیت اسی رنگا رنگی کا عظیم نمونہ ہے اور ہندوستان اسی رنگا رنگی کا خوبصورت سنگم ہے۔ یہاں ہمیں اُن سب رنگوں کو ملا کر دیکھنا ہے۔ فرق کو، جدا جدا خصوصیات کو، پامال کر کے یا مٹا کر نہیں بلکہ اُس کی عظیم ترین شکل میں، وسعتِ قلب سے، انسان سے محبت رکھتے ہوئے، اونچ نیچ، اپنے پرائے، سب کی خدمت میں ہی بھگوان ملے گا، اور یہی بھگوان کی سیوا ہے ۔۔۔ اور

---

[1] یورپی قومیت کے سلسلے میں ٹیگور کی انگریزی تصنیف Nationalism دیکھئے

کچھ نہیں۔ نیک کوشش سے ملک کو فتح
کرو۔ جو تم کو شک وشبہ کی نظر سے
دیکھتے ہیں اُن کا دِل جیت لو، جو تم سے
نفرت کرتے ہیں اُن کے دِلوں سے نفرت
کو مٹا دو۔ بند دروازوں پر چوٹ کرو،
بار بار چوٹ کرو، کوئی نا امیدی، کسی
ذاتی غرور کو باقی نہ رکھو، اپنے غرور کو
مٹا دو۔ ایک انسان کا دِل ہمیشہ کے
لئے دوسرے انسان کے دل کو ٹھکرا نہیں سکتا۔"
(مضمون "مسائل" کلیات ٹیگور جلد ۱)

ٹیگور پوری انسانیت کو ایک تصور کرتے تھے اور اِسی بنا پر اُن کو "وِشوا کوی" یعنی "شاعرِ جہان" کہا گیا ہے۔ مضامین کے علاوہ کئی نظموں اور گیتوں میں اُن کی یہ عالم گیر محبت بھائی چارگی یا قومیت کا تصوّر نمایاں ہے۔ "گیتانجلی" کی ایک مشہور نظم "بھارت تیرتھ" کے چند اشعار دیکھئے جہاں شاعر یہ خواب دیکھتا ہے کہ بھارت کی اِس مقدس سرزمین (تیرتھ) پر تمام مذاہب کے لوگ، تمام رنگ ونسل کے لوگ آ ملے

ہیں اور اس طرح بھارت ہی دُنیا میں پہلا بین الاقوامی ملک بنا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

آؤ، آؤ، آریہ آؤ
آؤ — غیر آریہ آؤ
آؤ — ہندو اور مسلمان
چلے آؤ، اے انگریز — آج تم بھی چلے آؤ
آؤ، آؤ اے عیسائی
اور اے برہمن — دِل صاف کر کے تم بھی چلے آؤ
آؤ — اور سب کا ہاتھ تھام لو —"

اُردو ادب میں مولانا حالیؔ، اکبر الہ آبادی، اقبالؔ اور چکبست چند ایسے نام ہیں جنھوں نے اردو شاعری میں حبِ وطن اور قومیت کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اقبالؔ نے جو غزلیں کم کہی ہیں۔ اور نظمیں زیادہ اِس کی وجہ بھی یہی ہے کہ غزل کا دامن اُن کو اپنے بھرپور جذبات کی ادائیگی کے لئے تنگ نظر آیا۔ حالانکہ اقبالؔ فلسفی ہونے کی وجہ سے ایسے موقعوں پر بھی اُن کے لب و لہجہ میں اُن کا حکیمانہ رنگ غالب رہا ہے۔ اقبالؔ کی ایسی نظموں ہی نے اقبالؔ کے بعد اُردو شاعری میں قدم

رکھنے والے نوجوانوں کو متاثر کیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کے بعد جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لیے شعراء کی ایک بھاری فوج اُتر آئی جن میں مجاز لکھنوی، مخدوم محی الدین اور شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی اہم نام ہیں۔

اقبال کے ابتدائی افکار میں آزادی وطن اور قومیت کے سلسلے میں جو رجحانات پائے جاتے ہیں اُن سے صاف ہے کہ دورِ اوّل میں، ایک عرصہ تک وہ اتحاد واشتراک کے حامی تھے اور متحدہ قومیت کے پرستار تھے۔ وہ ہندو، مسلم سکھ، عیسائی سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے تھے اور یک جہتی کے طرفدار تھے۔ اُن کے ابتدائی خیالات ذیل کے چند اقتباسات سے واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

"مذہب دنیا میں صلح کرانے کے لئے آیا ہے نہ کہ جنگ کی غرض سے۔ اگر اس تحریک (سودیشی تحریک) سے ہندو اور مسلمانوں میں اتحادِ اغراض پیدا ہو جائے اور رفتہ رفتہ قوی ہوتا جائے تو سبحان اللہ اور کیا چاہیے۔ ہندوستان کے سوئے ہوئے نصیب بیدار ہوں اور میرے دیرینہ وطن کا

نام جلی قلم سے فرق اقوام میں لکھا جائے"۔ ۱

"نوعِ انسانی کی عام بھلائی کے لئے میں یہاں
کے (ہند کے) مسلمانوں اور ہندوؤں کی
مفاہمت کا متمنی ہوں اور اسے اشد ضروری
خیال کرتا ہوں۔ صرف باشندگانِ ہند ہی
پرانی دنیا کے کھنڈروں پر نئے آدم کے لئے
نئی دنیا تعمیر کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں"۔ ۲

"ہمارے ملک میں محبت اور مروت کی بو
باقی نہیں رہی۔ ہم اُس کو پکا مسلمان
سمجھتے ہیں جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا
ہو اور اُس کو پکا ہندو خیال کرتے
ہیں جو مسلمان کی جان کا دشمن ہو"۔ ۳

یا پھر اقبالؔ کے ایسے اشعار جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں
کے باہمی اتحاد پر انھوں نے زور دیا ہے۔ مثلاً :-

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

۱۔ مضمون "سودیشی تحریک" ۱۹۰۶ء اقبالؔ
۲۔ مضمون "مذہب اور سیاست" اقبالؔ
۳۔ خطوط اقبالؔ۔ از رفیع الدین ہاشمی خط نمبر ۲ بنام مولوی انشاء اللہ خاں۔

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے جی کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوحِ نبی کا ٹھہرا آکر جہاں سفینا
میرا وطن وہی ہے

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
ہوئے اغیار ملت وآئیں کی موجوں سے
غضب کا تفرقہ ڈالا ترے خرمن کے دانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ایک عرصہ تک اقبال نے اُن کے وطنیت کے تصوّر سے مذہب کا کوئی ٹکراؤ نہیں پایا اور کہا کہ مذہب سے رنگ قومیت بدل نہیں سکتا۔ وہ مذہب کو انسان کے روح کا معاملہ سمجھتے رہے اور کہتے رہے کہ محبت سے سارے عالم کو جیتا جا سکتا ہے۔ مثلاً دیکھیے :-

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی
کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی
روح کا جوبن نکھرتا ہے اِسی تدبیر سے
آدمی سونے کا بن جاتا ہے اسی اکسیر سے
رنگِ قومیت مگر اِس سے بدل سکتا نہیں
خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں

....

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے
شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے

کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

اقبال مغربی سیاست کا مطالعہ کرنے کے بعد اِس نتیجہ پر پہونچے کہ مغربی وطنیت ایک ایسی شئے ہے جس کی تبلیغ سے یورپ والے دنیا کے دیگر ممالک کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے وطنیت کا جوش صرف دوسرے ممالک کو لوٹنے اور غلام بنانے کے لئے ہی ہے۔ اس لئے اقبال نے اُن کے نظریہ وطنیت کی مخالفت کی اور اِس مخالفت کو اپنا مشن بنا لیا۔ اقبال کے نظریۂ وطنیت میں تبدیلی رفتہ رفتہ آتی گئی۔ وہ قومیت کے لیے جغرافیائی حدود کو بیکار سمجھنے لگے چونکہ ایسی قومیت سے انسانیت کا نظریہ محدود ہو جاتا ہے۔ لیکن اسکے بعد اقبال نے لفظ قوم یا قومیت کے بدلے لفظ "ملت" کو اپنا لیا۔ اور پہلے پہل "ملت" سے انھوں نے "مسلمانوں کی ایک عالمگیر برادری" کو ہی سمجھا۔ ٹیگور نے مادرِ وطن کی دیوی سے یہ التجا کی کہ وہ اپنے بچوں کو ممتا سے گود میں لئے نہ رہے بلکہ اُن کو دیس دیس میں نکل جانے دے، ٹھوکریں کھانے دے اور اپنی قسمت آزمانے دے، اپنا مقام بنا لینے دے لیکن ٹیگور کے "بچوں" میں ہندو مسلم سبھی شامل ہیں۔

اقبال نے بھی مقامی قید کی مخالفت کی ہے لیکن وہ صرف مسلمانوں سے ہی مخاطب ہیں، اور اس سلسلے میں اُن کا کلام اسلامی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک قوم قرار دے دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اپنی مِلّت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر مِلّت میں گم ہو جا
نہ تورانی ہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی

....

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنّتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

....

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

اقبال نے جب سیاست میں قدم رکھا تب تک اُن کا نظریہ قومیت بدل چکا تھا۔ وہ متحدہ قومیت کے راستے سے ہٹ کر دُور بہت دُور نکل گئے تھے۔ اُن کے کلام پر اسلامی رنگ نہایت گہرا ہو گیا تھا اور قومیت کے لیے انھوں نے مذہب ہی کو بنیاد تسلیم کر لیا تھا۔ مجموعی طور پر اردو ادب کے نقادوں میں بھاری اکثریت نے اقبال کو "اسلامی شاعر" ہی قرار دیا ہے۔ بعض ہندوستانی نقاد اُن کو پاکستان کا خالق نہیں لکھتے ہیں اور نہ ہی اُن کو اسلامی شاعر کہتے ہیں لیکن پاکستانی نقاد ڈنکے کی چوٹ پر اقبال کو پاکستان کا خالق کہتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ اقبال نے دو قومی نظریہ پیش کیا ہے اور اُن کے اِسی نظریہ کی ترقی یافتہ آخری شکل "پاکستان" ہے۔ ہندوستانی نقاد جو

کبھی نہ کسی طرح اُن کو دو قومی نظریہ کا قائل قرار دینا نہیں
چاہتے وہ یہ کہتے ہیں کہ اقبالؔ نے لفظ پاکستان کا کہیں استعمال
نہیں کیا ہے اور انھوں نے دو قومی نظریہ پیش نہیں کیا۔ لیکن
لفظ "پاکستان" کا استعمال ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، یہ حقیقت ہے
کہ اقبالؔ متحدہ قومیت کے خلاف تھے اور مذہب ہی کو قومیت
کی بنیاد تسلیم کرتے تھے۔ اِس حد تک ہندوستانی نقاد بھی
مانے بغیر نہیں رہ سکتے چونکہ اقبالؔ نے بار بار متحدہ قومیت کی
مخالفت کی ہے اور اِس طرح دو قومی نہیں تو کئی قومی نظریہ
پیش کیا ہے، چونکہ اگر مذہب ہی قومیت کی جڑ ہو، تو
ہر مذہب کے ماننے والے کو الگ الگ قوم تسلیم کرنا پڑے گا
بہرحال مختصر یہی ہے کہ اقبالؔ متحدہ ہندوستانی قومیت کے
خلاف تھے۔ اور ایسی آزادی کے بھی خلاف تھے جس میں مکمل
طور پر مذہبی آزادی نہ ہو اور اسلامی اصولوں پر حکومت قائم نہ
ہو۔ اِس سلسلے میں اقبالؔ کی تحریروں سے چند اقتباسات
ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:۔

" ابتداء میں میں بھی قومیت پر اعتقاد رکھتا
تھا اور ہندوستان کی متحدہ قومیت کا
خواب شاید سب سے پہلے میں نے دیکھا تھا

لیکن تجربے اور خیالات کی وسعت نے میرے
خیال میں تبدیلی کردی "۔[1]

"اگر مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین
اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصوّر کے
یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو ہر وقت
انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ
تو لادینی ہو گا "۔[2]

" ایک یہ کہ مسلمان بحیثیت قوم اور ہو سکتے ہیں
اور بحیثیت ملت اور ۔ دوسرا یہ کہ ازروئے
قوم اور ہو سکتے ہیں ۔ اسلئے مذہب کو
علیحدہ چھوڑ کر انھیں باقی اقوام ہند کی
قومیت یا ہندوستانیت میں جذب ہونا
چاہئے ۔ یہ صرف قوم اور ملت کے الفاظ
کا فرق ہے ورنہ نظریہ وہی ہے جس کا
اوپر ذکر ہوا اور جس کے اختیار کے لئے
اس ملک کی اکثریت اور اس کے رہنما

---

[1] خط بنام سید محمد سعید الدین جعفری ۔ خطوط اقبال ۔ از رفیع الدین ہاشمی ۔

[2] "اسلام اور قومیت" ۔ اقبال

آئے دن یہاں کے مسلمانوں کو تلقین کرتے رہتے ہیں یعنی یہ کہ مذہب اور سیاست جدا جدا چیزیں ہیں۔ اس ملک میں رہنا ہے تو مذہب کو محض انفرادی اور پرائیویٹ چیز سمجھو اور اسکو افراد تک ہی محدود رکھو سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو کوئی دوسری علیحدہ قوم نہ تصور کرو.....'' ؎۱

''مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اسکے اقتدار کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے اور اس آزادی سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اوّل مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقت ور بن جائے اسلیے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہوسکتا جس کی بنیادیں ان ہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد

؎۱ "اسلام اور قومیت"۔ اقبال،

تک دار السلام بن جائے" ؎۱

"مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان، نہ اشتراک وطن، نہ اشتراکِ اغراض اقتصادی بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی، اسلئے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے" ؎۲

"جداگانہ انتخابات کو غیر مشروط طور پر قائم رکھ کر حکومت نے مسلمانوں کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنا مستقبل آپ متعین کر لیں اگر آج مسلمانوں نے قبل از وقت جداگانہ انتخاب سے دست برداری کر لی تو آئندہ

؎۱ "اسلام اور قومیت" - اقبال

؎۲ ملت بیضاء پر ایک عمرانی نظر - اقبال

مورخ اُن کے ہندوستان میں سیاسی
اعتبار سے مٹ جانے کے لئے حکومت
برطانیہ کو ہرگز مطعون نہ کرے گا بلکہ خود
مسلمانوں کو اس بات کا مجرم قرار دیگا"[1]
"اگر ملک کے ایک حصے میں ایک اسلامی
اسٹیٹ قائم ہو جائے تو معاشرتی زندگی
بہت جلد سنور سکتی ہے۔"[2]

جب اقبالؔ اور نذرالاسلام کی شاعری کے شباب کا زمانہ آیا تب ٹیگور کی عمر ڈھل چکی تھی۔ ٹیگور کا ایک مقبول گیت ہے :۔۔۔۔ "تومار ہلو شورُو، آمار ہلو سارا"

یعنی ٹیگور کہتے ہیں ـــــ "تمہارے کام کی تو ابتداء ہے اور میرا کام تمام ہو چکا ہے، پورا ہو چکا ہے۔ اب تم کرو، مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا میں نے کیا ہے ـــ"

نذرالاسلام آندھی اور طوفان کی طرح دنیائے ادب میں آئے اور پھر یکایک قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ وہ ۱۹۴۲ء میں خاموش ہو گئے۔ لیکن اِن چند سالوں ہی میں علام

---

[1] خط بنام ڈائرکٹر ہمدم لکھنؤ۔ خطوط اقبالؔ۔ از رفیع الدین ہاشمی
[2] خط بنام بیگم صاحبہ ۔ " "

ہندوستانی قوم کو خواب غفلت سے جگانے میں انھوں نے نمایاں حصّہ لیا۔ انھوں نے میٹھے میٹھے ترانے گا کر نہیں بلکہ ڈنکے کی گھن گرج چوٹوں سے قوم کو غفلت کی نیند سے بیدار کیا۔ نذرالاسلام کی قومی شاعری (بلکہ پوری شاعری) میں خودداریت، خوداعتمادی، بھرپور ہمت، جواں مردی اور بہادری کا ولولہ ہے۔ انھوں نے قوم کے ہر طبقہ کو ساتھ لیا، چاہے وہ دیس کے نوجوان ہوں، کسان ہو یا مزدور، مرد ہو یا عورت۔ اُن میں فرقہ وارانہ تعصب کا کہیں نام و نشان تک نہیں ہے۔ کوئی اُن کو صرف ہندو یا صرف مسلمان شاعر کہہ نہیں سکتا۔ وہ پوری قوم کو اپنے ساتھ لے کر چلتے رہے۔ مخدوم محی الدین کا یہ شعر نذرالاسلام کی زندگی پر پورا اُترتا ہے۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو

چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اب ذیل میں چند اشعار پیش کرتا ہوں جن سے نذرالاسلام کی وطن دوستی، غلامی سے نفرت، آزادی کی لگن، قومی شعور کی بلندی اور ہندو مسلم اتحاد جیسے مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔

رات اندھیری ہے
محبّانِ وطن پاسبانو ـــــ ہوشیار
مدّت دراز کے دیرینہ درد و الم نے جنگ کا اعلان کر دیا ہے
محروم سینوں میں
گہرے احساس انگڑائیاں لے رہے ہیں
اُنھیں راستہ پر ضرور لانا ہوگا ـــ اور
حقِ خود ارادیت دلانا ہوگا

بے بس قوم ڈوب کر مر رہی ہے
اُسے تیرنا نہیں آتا
اے ناخدا ـــ
آج ہم دیکھ لیں گے ـــ کہ
اپنے وطن کو آزاد کرنے کے لئے تجھ میں عزم ہے یا نہیں۔
کون بد بخت پوچھتا ہے کہ
"وہ ہندو ہیں یا مسلمان" ؟
اے ناخدا! کہہ دے
انسان ڈوب رہا ہے
اپنی ماں کی اولاد ڈوب رہی ہے ـــ !

(ناخدا)

جس دیس میں سورج ڈوبا کرتا تھا۔
آج وہیں آفتابِ محشر چمک رہا ہے
مدتوں تک اپنے خون اور پسینے سے سینچ کر
جس خاک کو ہم نے کیمیا بنایا تھا
جس زمین پہ ہم نے پھول کھلائے تھے
جہاں ہم نے پریت کے گیت گائے تھے
آہ! آج اسی گلستاں پر ہمارا کوئی اختیار نہیں
آہ! آج اپنے گھر پر ہمارا کوئی بس نہیں۔
(طوفان آگیا)

مادرِ وطن

جاگ جا، اور اس نذر کو قبول کر
اگر ہمارے گناہوں کی کوئی تلافی نہیں
اگر ہماری شام کی کوئی صبح نہیں
تو لِلّٰہ اُٹھ اور ہم سب کو فنا کر دے
ہمیں درندگی کی زندگی —— اور
بے حیائی کی موت گوارا نہیں
مرنا ہے —— تو
ہم سپوتوں کی طرح کیوں نہ مریں۔ (شامِ وطن)

میں اُس کا ثنا خواں ہوں
اُس کا حمد گو ہوں
پھانسی کی رسّی جس کے گلوگیر ہوتی ہے
جس کے خون سے شفق سرخی حاصل کرتی ہے
قید خانے میں
جس کی خدمت کے لئے
آزادی کی دیوی آتی ہے
میں اُسی کے گیت گاتا ہوں۔

(پیامِ شباب)

۴

اب دیکھا جائے کہ ہمارے اِن شعراء نے ملک میں انقلاب لانے کے لئے عوام کو کیسے تیار کیا۔؟ وہ کس قسم کا انقلاب چاہتے تھے۔ کیا وہ سوشلزم کے حامی تھے اور اگر سوشلزم چاہتے تھے تو کس قسم کا ؟ کیا وہ اشتراکیت یا کمیونزم سے آگاہ تھے اور اگر تھے تو اشتراکیت کے سلسلے میں اُن کا کیا خیال تھا۔؟

انسان کی نظر میں وسعت و گہرائی کے لئے مطالعہ اور مشاہدہ دونوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے تینوں شعراء میں غالباً سب سے زیادہ کتب بینی ٹیگور نے کی ہے اور اِس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ دنیا کا سفر ٹیگور نے سب سے زیادہ کیا ہے اور روس میں کمیونزم آنے کے بعد (سنہ ۱۹۳۰ء) میں ٹیگور نے اُس ملک کا بھی سفر کیا۔ انقلاب روس کا اثر پوری دنیا پر نہایت گہرا ہوا، اور اِس انقلاب سے ہندوستانی کے سیاسی رہنماؤں کے علاوہ یہاں کے شعراء و ادباء نے بھی نمایاں اثر قبول کیا ہے۔ ٹیگور۔ اقبال اور نذر الاسلام سب نے روسی انقلاب سے اثر قبول کیا ہے۔ ٹیگور نے سفرنامہ روس یعنی "روس کے خطوط" میں اپنے خیالات کا اِس سلسلے میں کھُل کر اظہار کیا ہے۔ اقبال نے بھی چند نظموں میں اپنے انقلابی نظریات کی تشریح کی ہے اور نذر الاسلام کے کلام میں تو ہمیں قدم قدم پر روسی انقلاب اور اشتراکیت کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔

ٹیگور نہ سیاست داں تھے، نہ انقلابی اور نہ باغی۔ انھوں نے خود بار بار کہا ہے کہ "میں باغی نہیں ہوں، بہادر نہیں ہوں" وہ اوّل تا آخر فنکار رہے۔ لیکن حقیقت پسند فنکار، اور

کوئی حقیقت پسند فنکار حالاتِ زمانہ سے اپنے آپ کو دُور نہیں رکھ سکتا۔ ٹیگور نے یورپ کے علوم، صنعتی ترقی اور ادبی ترقی کے گُن گائے ہیں۔ انھوں نے یورپ میں بھی انسان دیکھے اور اُنھیں انسانیت پر کامل یقین تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ٹیگور نے انگریزوں اور یورپی اقوام کی لوٹ کھسوٹ، اُن کے فلسفۂ سامراجیت اور دیگر قوموں کو محکوم بنائے رکھنے کی پالیسی کے خلاف اُس عہد میں بھی بیشمار مضامین لکھے ہیں۔ جب کانگریس کے رہنما، حکومتِ وقت کے خلاف لب کھولنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے اُس عہد میں بھی سامراجیت کی مخالفت کی جب مہاتما گاندھی تک کا خیال تھا کہ انگریزوں کے سایہ تلے ہندوستان نے ترقی کی ہے۔ سامراجیت کے سلسلے میں (بنگلہ ۱۳۱۲ھ، ۱۹۰۴ء) ٹیگور نے لکھا:—

"ولایت میں اب اِمپریلزم کا ایک نشہ طاری ہے۔ تمام محکوم اور غلام ممالک کو ملا کر انگریزی سامراج قائم کرنے کے لئے اُس ملک کے کئی لوگ مشغول ہیں ...... تاریخ بتاتی ہے کہ اِس طرح کا سامراج قائم کرنے

کے سلسلے میں کئی بار، تاریخ کے مختلف عہد
میں کوششیں ہوئی ہیں۔ لیکن یہ مطلب
دیرپا، ٹِک کر نہیں رہ سکا، قائم نہیں رہا۔
ہاں مٹنے سے پہلے دنیا کو کافی نقصان
پہنچا جاتا ہے —"

(مضمون۔ اِمپیریلیزم)

سفرِ روس (۱۹۳۰ء) کے دوران انھوں نے جو خطوط لکھے،
اُن سے صاف ہے کہ کمیونزم سے وہ بے حد متاثر ہوئے تھے[1]
اور کمیونسٹ سماج کی ترقی دیکھ کر انھوں نے کمیونزم ہی کو موجودہ
سماج کا علاج قرار دیا۔ انھوں نے لکھا —— "بالآخر روس
آیا ہوا، جو کچھ دیکھا تعجب ہوا، کسی اور ملک کی طرح نہیں۔ ایک
دم بنیادی فرق ہے۔ ابتدا تا انتہا سب کو یہ لوگ مساوی طور
پر بیدار کر چکے ہیں —" انھوں نے کہا کہ پہلے میرا یہ خیال تھا کہ
اگر چراغ جلتا ہو، تو اُسکے تلے اندھیرا ہونا ضروری ہے لیکن
روس میں میں نے دیکھا کہ چراغ روشن ہے اور اُسکے تلے
نام کو اندھیرا نہیں ہے۔ روس کے خطوط سے طویل اقتباس

---

[1] ان کے خطوط کا ترجمہ میں نے ۱۹۶۳ء میں کیا تھا جو اُن دنوں ہفت روزہ
"عبرت" ہوڑہ میں مسلسل شائع ہوئے تھے۔

دینا یہاں ضروری نہیں ہے ۔ دیگر چند مضامین اور نظموں میں بھی ٹیگور نے اشتراکی خیالات کو پیش کیا ہے ۔ نوجوانوں کو مخاطب کر کے ٹیگور کہتے ہیں :۔

"دنیا کی ہر بڑی تہذیب ہمت مرداں کا نتیجہ ہے ۔ لیکن کیا ہمارے ملک میں ایسے ہمت والے نوجوان نہیں ہیں ۔؟ ہیں اور یقیناً ہیں چونکہ وہ فطری پیداوار ہیں ۔ زندگی خود اپنی ضرورت اور بقاء کے لئے اُن کو پیدا کرتی ہے ۔ جو لوگ اُن کو دبا کر رکھنا چاہتے ہیں ۔ خاموش کر کے رکھنا چاہتے ہیں وہ کب تک رکھ سکیں گے ؟ وہ اور ملک کے نوجوانوں کو خاموش نہیں رکھ سکتے ۔ اُن بزرگوں کو بیٹھے رہنے دو اور باقی سب راستوں پر نکل پڑیں ۔ وہاں نوجوانوں کو فتح نصیب ہو ۔ اُن کے قدموں تلے جنگل روندہ کر مر جائے ۔ کانٹے پس جائیں ، راستہ صاف ہو جائے ۔ اُن کی تیز رفتاری سے ناممکن بھی ممکن بن

جائے گا ۔۔۔"

(کالانتر صفحہ ۲۷ ۔)

"جانتا ہوں، مشکلات ہیں
آفت ہیں، ٹھوکریں ہیں
اور یہ سب جانتا ہوں ۔۔۔ تب ہی تو
دل خوشی سے ناچنے لگتا ہے
۔۔۔ اے میرے نوجوان
آزاد نوجوان
۔۔۔ آؤ، آؤ ۔۔۔"

(نظم ۔ نونہالوں کا سفر ۱۴ - ۱۳ - ۱۸ - ۱۹۶۶ء)

کانگریس میں جب اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے درمیان اختلافات شدید ہو گئے اور اعتدال پسندوں نے انتہا پسندوں کو نکال باہر کیا اور اس طرح انقلابیوں کے خلاف اصلاح پسند کانگریس میں کامیاب ہوئے تب ٹیگور نے انتہا پسندوں کا ساتھ دیا ۔ ظالم مجسٹریٹ کنگس فورڈ کو موت کے گھاٹ اُتارنے جا کر (۳۰ اپریل ۱۹۰۸ء) جب پرپھولیہ اور کھودی رام بم سے زخمی ہو کر گرفتار ہو گئے اور ایک کے بعد

دیگر انقلابی گرفتار ہوئے تب بھی کانگریسی اعتدال پسندوں نے انگریز حکومت کے خوف سے اُن انقلابیوں کے خلاف بیانات دیے کہ "میں اِن کاموں میں نہیں ہوں، ایسے اقدامات کی طرفداری نہیں کرتا، یہ اُن لوگوں کا کام ہے، غلط اقدام ہے، میں پہلے ہی کہتا تھا کہ ایسا کرنا اچھا نہیں ہے" وغیرہ وغیرہ۔ تب ٹیگور نے ایسے رہنماؤں کو مخاطب کر کے لکھا:۔

"کسی دھماکہ خیز واقعہ کے بعد، اس طرح کی باتیں کرنا، دوسروں پر الزام دھرنا اور اپنی صفائی لگانے کو میں اپنی کمزوری سمجھتا ہوں۔ اس وقت جب کہ حاکم غصہ میں ہے، تب دوسروں کو گالی دے کر خود اپنے آپ کو بے داغ اور بھلا آدمی کے طور پر پیش کر کے کیا ہم نیچ کام نہیں کر رہے ہیں ..... اور یہ کہ جن لوگوں نے ایسا کیا ہے وہ گرفتار ہو گئے ہیں، اُن پر شاہی ظلم ٹوٹ پڑا ہے۔ ایسے وقت کسی طرف نہ دیکھ کر، کسی بات کا خیال نہ کرتے ہوئے اُن لوگوں کے خلاف آواز اُٹھانا، کسی

طرح بھی مردانگی نہیں ہے"

(مضمون سنگسار درشن)

ٹیگور نے اپنی نظم "سُوپربھات" میں نوجوان انقلابیوں کا اس طرح سواگت کیا ہے:-

اے گھر والو

کھولو، کھولو، دروازے کھولو

چھپ کر نہ رہو۔

جس کے پاس، جو کچھ بھی ہے

سب لے آؤ۔

سب کچھ دینا ہوگا

اب نیند میں غافل سوئے نہ رہو

جاگو، سب جاگو

دیکھو۔

کون ہیں جو طلوعِ آفتاب کے راستے پر

آواز دے رہے ہیں، پکار کر کہہ رہے ہیں

"کوئی ڈر نہیں، خوف نہیں، نکل پڑو، نکل آؤ

بے خوف ہوکر، نڈر ہوکر، اپنی زندگی کی قربانی دو

وہی امر ہو گا
وہی کبھی نہ مٹے گا۔"

اقبال بھی آزادیٔ وطن کے طالب تھے، انقلاب کے خواہاں تھے
جواہر لال نہرو نے بھی لکھا ہے کہ [1] "زندگی کے آخری دنوں
میں اقبال سوشلزم سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ روس کی عظیم
ترقی سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔" اقبال کی نظمیں مثلاً
لینن خدا کے حضور میں، اشتراکیت اور کارل مارکس کی آواز
وغیرہ سے بھی واضح ہے کہ مارکسی نقطۂ نظر سے وہ متاثر ہوئے
تھے۔ اقبال سرمایہ دارانہ نظام سے بیزار تھے اور سفر یورپ
نے اُن پر یہ واضح ہو چکا تھا کہ یورپ کا جمہوری نظام بھی
کارگر نہیں ہے۔ اِسی لئے وہ انقلاب چاہتے تھے۔ موجودہ
سماج میں تبدیلی چاہتے تھے۔ مثلاً اُن کے یہ اشعار
ملاحظہ ہوں:۔

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بے چارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

---

[1] نہرو - Discovery of India

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری!
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو
آزادی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے
قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ رفتار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
گیا دورِ سرمایہ داری گیا، تماشا دکھا کر مداری گیا
جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

مذکورہ اشعار اقبال کے انقلابی خیالات کا آئینہ ہے لیکن اقبال منزل کی تلاش میں ایک عرصہ تک ڈال ڈال پات پات پھدکتے رہے ہیں۔ کہیں کہیں وہ تخریب پسند یا دہشت پسند بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً اُن کا یہ مشہور شعر:-

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کبھی وہ فاشزم سے نہایت قریب ہو کر مسولینی کے گن گاتے ہیں، ہٹلر کو ہیرو قرار دیتے ہیں۔ وہ کارل مارکس اور لینن سے بھی متاثر ہوئے لیکن کہیں اُن کو سکون نہ ملا۔ اسلئے آخر کار وہ اسلامی شاعر بن گئے اور آخری عمر تک اُسی راہ پر چلتے رہے ہیں۔ لہذا اُن کی سوشلزم ہو یا اشتراکیت ہر خیال پر اُن کا اسلامی رنگ نمایاں ہے۔ اقبال کے یہاں ہمیں مشرق و مغرب کے کئی نامور فلسفیوں، ادیبوں، مفکروں اور سیاسی رہنماؤں کا ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے کبھی مصطفیٰ کمال، کبھی مسولینی، کبھی مارکس اور کبھی لینن کی تائید بھی کی ہے لیکن یہ تائید بالکل جنبہ دری ہے یعنی صرف اُن باتوں کی حد تک اقبال

نے تائید کی ہے جیسے اقبال نے اسلام کے خلاف نہیں کہا اور جب مصطفےٰ کمال، مسولینی یا کارل مارکس ولینن کا کوئی خیال اقبال کو اسلامی اقدار سے ٹکراتا ہوا محسوس ہوا تب انھوں نے کھل کر اُن خیالات کی مخالفت کی ہے۔ ڈاکٹر قریشی رقمطراز ہیں۔

"اِسی طرح اگر ہم اورنگ زیب اور اکبر کو لے لیں تو اقبال کے نقطۂ نظر کی اور زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے۔ اِدھر اورنگ زیب پر وہ ایک معرکتہ الآرا نظم لکھتے ہیں تو دوسری طرف وہ شہنشاہ اکبر اور دارا کی سخت الفاظ میں مذمت کرتے ہیں۔ کیوں۔؟ اِسلئے کہ اورنگ زیب اُن کے خیال میں اسلامی روایات، اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی اقدار کو زندہ کر رہا تھا اور اکبر اور دارا سرزمینِ ہند میں الحاد کا بیج بو رہے تھے۔ اسی طرح وہ اطالیہ کے مشہور سیاست داں اور ادیب میکیاولی اور یونان کے مشہور ترین فلسفی افلاطون کی

مذمت کرتے ہیں۔ [1]

اشتراکیت کو اقبال قبول نہ کر سکے چونکہ فلسفہ اسلام اور کمیونزم میں ان کو اسلام ہی بہتر معلوم ہوا۔ اقبال کا اس پر ایمان تھا کہ مسلمان اور مسلمان ہی دنیا کی امامت کے لئے پیدا ہوا ہے۔[2] لہذا اسلام سے بہتر اور کوئی نظام ہو ہی نہیں سکتا ۔۔۔ اقبال نے جگہ جگہ اور بار بار اپنے اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔ مثلاً

"بولشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے .... اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لئے ایک قسم کی لعنت ہے لیکن دنیا کو اسکے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے جیسا کہ بولشویک تحریک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم

---

[1] تلمیحات حیات و نظریات اقبال۔ از ڈاکٹر اکبر حسین قریشی
[2] " " "

نے اِس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیئے قانونِ میراث، حرمتِ ربا اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابلِ عمل بھی ہے[۱]

"موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو اُن کے طریقِ عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹیکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں اُن کے لیئے لازم ہے کہ اِس زمانے میں قرآنِ کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں[۲]"

"اسلامی معاشیات کی روح یہ ہے کہ سرمائے کی بڑی مقدار میں اضافے کو ناممکن بنا دیا جائے۔ مسولینی اور ہٹلر کا اندازِ فکر

---

[۱] ۔ انعام ایڈیٹرِ زمیندار ۔ خطوطِ اقبال ۔ مرتب رفیع الدین ہاشمی

[۲] ،، ،، ،، ،،

بھی یہی تھا ۔ بالشوزم نے سرمایہ داری کا
کلیتاً خاتمہ کر کے انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا
ہے ۔ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں میں
ہمیشہ اعتدال کا راستہ اختیار کرتا ہے ۔“ ۱۵

ہم نے دیکھا کہ ٹیگور اور اقبال دونوں سامراجیت کے خلاف تھے سرمایہ داری کے خلاف تھے اور آزادی کے حق میں تھے ۔ دونوں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے لوگوں کو آزادی کے لئے جدوجہد کرنے پر تیار کیا۔ ٹیگور کا اندازِ بیان شاعرانہ ہے ، وہ انقلاب کی باتیں بھی نہایت نرمی سے، شیریں الفاظ کی مدد سے کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ میں شاعر ہوں، سیاست داں نہیں ۔ اقبال بھی شاعر ہیں لیکن گرمی گفتار کچھ زیادہ ہی ہے ۔ لیکن وہ راہِ اسلام سے کبھی ایک انچ ادھر اُدھر چلنے پر تیار نہیں ہوتے ۔ وہ کمیونزم کو قبول نہیں کر سکے چونکہ وہ اشتراکی سماج ، اسلامی سماج سے میل نہیں رکھتا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اسلامی اسٹیٹ کے حق میں رہے ہیں ، دارالسلام کی تعمیر کے خواہاں رہے ہیں ۔

---

۱۵ خط بنام ڈاکٹر ریاض الحسن ۔ خطوطِ اقبال ۔ مرتب رفیع الدین ہاشمی ۔

نذرالاسلام نے جب بنگلہ ادب میں قدم رکھا تب بنگلہ ادب کے آسمان پر ربندر ناتھ ٹیگور آفتاب دوپہر کی طرح روشن تھے۔ صرف چند ستارے ہی اس آفتاب کے ہوتے ہوئے اپنی چمک دکھا سکے اور اُن تمام میں نذرالاسلام سب سے زیادہ روشن ستارے ہیں۔ نذرالاسلام مکمل طور پر باغی شاعر تھے، شاعر بغاوت تھے۔ وہ موجودہ سماج کو مکمل طور پر بدل کر اشتراکی سماج تعمیر کرنے کے حق میں رہے ہیں۔ ہر مذہب کے ماننے والوں کو انھوں نے اسی مقصد کے لیے للکارا ہے۔ وہ ہمیشہ مساوات اور مکمل مساوات کے گیت گاتے رہے ہیں۔ نذرل اُسی مساوات کو لانے کے لئے ملک کے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب کو آواز دیتے ہیں، مزدوروں، کسانوں، نوجوانوں، طلبا، اور خواتین سب کو عام دعوت دیتے ہیں کہ آؤ ــــ انقلاب لے آؤ ــــ مثلاً ذیل کے اشعار دیکھیے:۔

کہہ دے! اے جواں مرد، کہہ دے
کہ میں سر بلند ہوں
اتنا بلند، اتنا بلند کہ ہمالیہ کی چوٹی بھی
میرے آگے سرنگوں ہے۔ (باغی)

تم سب انقلاب کے نعرے بلند کرو
تم سب بغاوت کے گیت گاؤ
دیکھو! طوفان اور آندھیوں میں بھی سرنگوں نہ ہو کر
وہ دورِ جدید کا پرچم لہرا رہا ہے۔
(صورِ اسرافیل)

دیکھو دیکھو ― کہ
انقلاب کا دیوتا تمہارے سرہانے آکھڑا ہوا ہے
یہ دیوتا ہر زمانے میں آتا ہے
اور ایک نئے دور کا سندیسہ لاتا ہے
(کوئی زنجیر ہلاتا ہے)
نئی دنیا کی تلاش میں
جو برفستانوں کو پھاند آئے ― اور
ہواؤں میں تیرتے پھرے ― !
میں اُنھیں کے گیت گاتا ہوں !!
شباب کا ولولہ بے قید ہے
وہ چاند ستاروں میں،
جنت اور دوزخ میں
عرش اور فرش پر

ہر طرف پیامِ زندگی سُناتا پھرتا ہے

(میرے نغمے)

میرا رقصِ شرر

بغاوت اور انقلاب کی آندھیوں کو

تندی کا سبق دیتا ہے — !

میری ایک پھونک،

دوزخ کے کئی چراغ گُل کر دیتی ہے

اور میں حقارت سے موت کے منہ پر تھوکتا ہوں — !!

(ستارہ تخریب)

میں اُس کا ثنا خواں ہوں

اُس کا حمد گو ہوں

پھانسی کی رسّی جس کے گلو گیر ہوتی ہے

جس کے خون سے

شفق سرخی حاصل کرتی ہے

قید خانے میں جس کی خدمت کے لئے

آزادی کی دیوی آتی ہے

میں اُسی کے گیت گاتا ہوں

(پیامِ شباب)

میں اُس مساوات کے گیت گاتا ہوں

جہاں پہونچ کر

سب اختلافات اور تفرقے مٹ جاتے ہیں

(اشتراکی)

ہمارے سر پہ

چاند اور ستارے پھول بن کر برس پڑیں

کہ ــــ ہم نے

ایک جہانِ نو کی داغ بیل ڈالی ہے ـ !

ساری دنیا کے انسان سُن لیں کہ ہم سب

ایک ہی کارواں کے مسافر ہیں

اگر ایک کو تکلیف ہوگی

تو سب کے دل اُس کی کھٹک محسوس کریں گے

ایک کی توہین

بنی نوعِ انسان کی توہین ہے ـ

(نعرۂ انقلاب)

۵

مذہب ــــــ مذہبی لحاظ سے ٹیگور ہندو تھے اور

اقبال و نذرالاسلام مسلمان ۔ ان تینوں میں کوئی بھی فرقہ پرست نہیں تھا اور نہ ہی دوسروں کے مذاہب کی انھوں نے مخالفت کی ہے ۔ مذہب کے نام پر عوام کو جس طرح ملّا اور پنڈت لوٹتے ہیں ، تینوں شعراء نے عوام کو اس سے آگاہ کیا ۔ مذہب کے نام پر جو سیکڑوں فرسودہ رسم و رواج سماج کو آکاش بیل کی طرح جکڑے ہوئے ہیں ہمارے تینوں شعراء نے ایسے رسم و رواج کے خلاف آواز اٹھائی ہے ۔

مقام افسوس ہے کہ پاکستان کے بیشتر ادیبوں نے اقبال اور نذرل کو محض پاکستان اور مسلمانوں کا شاعر اور ٹیگور کو ہندوستان اور ہندوؤں کا شاعر قرار دیا ہے ۔ اقبال کو تو بیشتر نے شاعر اسلام ، دو قومی نظریہ کا خالق اور مفکر پاکستان ہی لکھا ہے لیکن تعجب ہے کہ نذرالاسلام جیسے باغی شاعر کے سلسلے میں بھی کئی نامور پاکستانی ادیبوں نے ایسی ہی باتیں لکھی ہیں اور ان کو بھی شاعر اسلام ، مسلمانوں کا شاعر اور حتیٰ کہ پاکستان کا حامی قرار دیا ہے ۔ مثلاً ڈاکٹر غلام شاہ وانی جیسے عالم و ادیب نے لکھا ہے ۔

” رہا دو قومی نظریہ کا سوال ۔ تو کیا شروع میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی

جیسے مجاہدانِ ملت بھی کانگریس کے رفیق اور متحدہ قومیت کے حامی نہ تھے۔ کیا قائداعظم کی قوم پرستی کا آغاز کانگریس کی رکنیت سے نہیں ہوا تھا۔ کیا علامہ اقبال نے ترانۂ ہندی اور نیا شوالہ لکھ کر متحدہ قومیت کا راگ نہیں الاپا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر ۱۹۴۲ء میں نذرالاسلام کا دماغی توازن درہم برہم نہ ہوگیا ہوتا تو وہ بھی ہندوؤں کی دھاندلی سے متاثر ہوکر انجام کار دوسرے اکابرِ ملت کی طرح پاکستان کے حامی نہ بن جاتے" ۱

پروفیسر محمد عبداللہ نے نذرالاسلام کو ترقی پسند انقلابی اور باغی شاعر کے طور پر ہی پیش کیا ہے لیکن بار بار وہ کبھی راستے سے ہٹ کر نذرالاسلام کو پاکستانی شاعر قرار دینے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں۔ ۲

"نذرالاسلام پاک وہند میں پیدا ہوئے۔

۱۔ کتاب "نذرالاسلام" مصنف محمد عبداللہ کا تعارف جو کہ ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے۔

۲۔ "نذرالاسلام" مصنف محمد عبداللہ۔

اس سرزمین میں ہندو بھی بستے ہیں
اور مسلمان بھی ۔ لہذا ان دونوں فرقوں کی
ذہنیت اور تہذیب و تمدن کی عکاسی
کرنا اُن کا فرض تھا ۔ انھوں نے اس
ادبی اور اخلاقی فریضہ پر عمل کیا ۔ قرآن
کے پہلو بہ پہلو پُران کو بھی مدنظر رکھا
اسکے سوا اُن کے لئے کوئی چارہ کار بھی
نہ تھا ۔ ہندوؤں کو نظر انداز کر کے مسلمانوں
کے لئے ادب پیدا کرنا یا مسلمانوں کو نظر
انداز کر کے ہندوؤں کے لئے ادب پیدا
کرنا اُن کے لئے ناممکن تھا کیونکہ وہ انسانیت
کے شاعر تھے ۔ انسانیت کی ترقی و تکمیل
ان کی منزلِ مقصود تھی ۔ اقبال کو دیکھئے
اُن کی شاعری اسلامی تہذیب و تمدن
کے لئے وقف ہے ۔ ربندر ناتھ کو دیکھئے
اُن کی شاعری میں ہندو تہذیب و تمدن
کی کارفرمائی ہے ــــ ہاں نذرالاسلام
بنگلہ ادب میں پہلے شخص ہیں جن کی

شاعری میں دو قومی نظریہ کا تصور ملتا ہے
جنھوں نے مسلمان اور غیر مسلمان کو الگ
الگ قوم قرار دیا۔ دونوں کے لئے الگ
الگ مذہبی تنظیمیں تھیں (صفحہ ۱۹۶) سرزمین
بنگال میں مسلمانوں کی آزادی کے خواب
دیکھنے والے نذرالاسلام کا خواب آج
شرمندہ تعبیر ہوا۔ پاک و ہند کے
مسلمانوں کو آج صرف آزادی ہی نہیں
ملی۔ انھیں ایک آزاد وطن۔ پاکستان
بھی ملا۔ لہذا ہم کہیں گے کہ نذرالاسلام
ہمارے قومی شاعر ہیں۔" (صفحہ ۲۰۴)
"نذرالاسلام نے کبھی زور بیان اور تاثیر
کلام کے لئے، کبھی اسلامی تہذیب و
تمدن کی ترجمانی کی خاطر اور کبھی شاعرانہ
آرٹ کے تقاضوں پر عربی، فارسی اور
اردو الفاظ کا استعمال کیا۔ اور بنگلہ زبان
و ادب کو ایک گراں قدر لفظی سرمایہ
بخشا۔ اسے نئے نئے تصورات سے

آشنا کیا، اسلامی ادب کے ایک بیش
بہا ذخیرے سے اس کا درجہ بلند کیا
اسکو اسلامی سانچوں میں ڈھال کر آنے
والی نسلوں کے لئے "پاکستانی بنگلہ" وجود
میں لانے اور اسکے فروغ دینے کا راستہ
ہموار کیا۔" (ص ۲۱۷)

"یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ بنگال کے مسلمان کسی
شاعر کے اس قدر مرہونِ منّت نہیں جتنے
کہ وہ نذر الاسلام کے ہیں۔ انھوں نے بنگال
کے چار پانچ کروڑ مسلمانوں کو سوزِ حیات بخشا
یوں تو اُن کی شاعری کا اثر پورے پاک
و ہند پر ہوا مگر بنگال کے مسلمانوں پر اس
کا اثر نمایاں طور پر ہوا۔ انھوں نے قوم
میں انقلاب کا جو بیج بویا تھا، وہ ایک
تناور درخت بن کر تحریکِ پاکستان کی
شکل میں نمودار ہوا۔ ہمیں جو پاکستان
ملا ہے، وہ بڑی حد تک اُن کی انقلابی تحریک
کا ثمرہ ہے۔" (ص ۲۳۰)

اس طرح کی مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں چونکہ نذر الاسلام کو بھی صرف مسلمانوں کا شاعر یا شاعر پاکستان قرار دینے کی کوشش پاکستان کے کئی ادباء نے کیا ہے لیکن مزید مثالیں دے کر مضمون کو طویل کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔

جدید بنگلہ ادب کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے شہزاد منظر رقم طراز ہیں:[1]

"جدید بنگلہ ادب کی اس زبردست ترقی کے باوجود اس میں بنگال کے اکثریتی فرقہ (مسلمانوں) کی زندگی کی عکاسی نہیں کی گئی ہے اور نہ انھیں کوئی نمائندگی حاصل ہے کیونکہ جدید بنگلہ ادب کی تخلیق کرنے والے تمام تر ہندو مصنف تھے اور انھوں نے ہندو مذہب اور روایت کے زیر اثر ادب کی تخلیق کیا تھا" یہ بات درست ہے کہ مسلمانوں کا ذکر ہندو فنکاروں نے کم کیا ہے اور یہ فطری بات ہے چونکہ فنکار کے خیالات پر اسکے گھریلو حالات اور ماحول کا گہرا اثر ہوتا ہے لیکن اسکے باوجود جو چند مسلم کردار ہندو ادیبوں نے پیش کئے ہیں وہ بنگلہ ادب میں موضوع بحث بنا رہا۔ ٹیگور کے سیاسی مضامین کے مطالعے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ

1۔ "بنگلہ ادب کا تاریخی منظر" شہزاد منظر سہ ماہی دائرہ ڈھاکہ اپریل ۱۹۷۰ء

وہ مسلمانوں کے سچے دوست تھے اور انھوں نے خود ہندو ہوتے ہوئے ہندوؤں کی فرقہ پرستی کا جن سخت الفاظ میں مخالفت کی ہے اُس کی مثال دورِ جدید کے ادب میں کہیں پایا نہیں جاتا۔ ایسی تلخ حقیقت کا کھل کر اظہار ایک عظیم انسان دوست شاعر ہی کر سکتا ہے۔ چند نمونے پیش کرتا ہوں۔

ستمبر ۱۹۱۷ء میں ضلع شاہ آباد (ریاست بہار) میں ہندو مسلم فساد ہوا تھا۔ عید قرباں کے موقع پر ہندوؤں نے زبردستی گوکشی (ذبیحہ) بند کرنے کی کوشش کی تھی اور یہی فساد کی وجہ رہی ہے۔ اس فساد پر روشنی ڈالتے ہوئے ٹیگور نے ہندوؤں کو سخت بُرا بھلا کہتے ہوئے لکھا:-

جب ہوم رول کی موسمی فضا بحرِ عرب کو پار کر رہا تھا، موسلا دھار بارش کے موسم کی آمد آمد تھی، ٹھیک ایسے وقت پر بہار میں موسلا دھار ہنگامہ شروع ہوا یعنی مسلمانوں پر ہندوؤں نے ہنگامہ برپا کر دیا دیگر ممالک میں بھی کبھی کبھی کبھار ایک فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے۔ ہمارے ملک میں جو جھگڑے

ہوتے ہیں وہ مذہب کو لے کر ہوتے
ہیں حالانکہ ہم زبانی طور پر ہمیشہ بڑھائی
کرتے ہیں کہ دھرم کے سلسلے میں ہندو
اتنے فراخ دل ہیں کہ دنیا میں اُن کی
مثال نہیں ملتی .... یہ بات تسلیم کرنی
پڑے گی کہ ہمارے ملک میں مذہب کی
بنیاد پر ہندو مسلم اختلافات ہیں ......
ہم خود اپنے مذہب کے نام پر جانور کی
قربانی دیتے ہیں لیکن اگر دیگر لوگ اُن
کے دھرم کے نام پر جانور کی قربانی دیں
تو ہم انسان کی قربانی، انسانوں کو
موت کے گھاٹ اُتارنے کا انتظام
کرتے ہیں۔ کیا ایسے اقدام کو ظلم و زیادتی
کے علاوہ اور کوئی نام دیا جا سکتا ہے"؟

ٹیگور اس فرقہ دارانہ ذہنیت کی وجہ بھی غلامی ہی کو
قرار دیتے ہیں اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر آزادی ملے تب چونکہ
آزاد شہری کے طور پہ ہندوستانیوں پر ذمہ داریاں عائد ہوں گی

اس لیے تب وہ خود ذمہ داری کے احساس سے سنبھل جائیں گے۔ اور اُن کا ذہن صاف ہو جائے گا۔ وہ اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں :-

"سماج کو چلانے کی ذمہ داری ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ حاکم باہر کے ہیں اور حاکم نے باہر سے ہمیں سنبھالنے کی ذمہ داری لی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے دل غیر ذمہ دار ہو گئے ہیں۔ اُداسی اور نا اُمیدی چھا گئی ہے۔ اگر ذمہ داری ہوتی تو اُس کو نبھانے میں اور کامیاب بنانے میں ہندو اور مسلمان دونوں کو مساوی غرض ہوتا۔"

۱۹۰۶ء میں ہندو مسلم مسئلہ کے سلسلے میں ٹیگور نے لکھا :-

"آج ہم سب یہ کہہ کر افسوس کرتے ہیں کہ انگریز نہایت رازداری سے مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اُبھار رہا ہے۔ اگر یہ بات سچ بھی ہو تو بھی انگریزوں پر لعنت کیوں۔؟ اصل مسئلہ سوچنے

کے لئے یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں
کے خلاف اُبھارا یا لگایا جا سکتا ہے۔
ہم میں جہاں پاپ (کمزوری) ہے دشمن
اُس سے فائدہ اٹھائیں گے ہی۔ ہندو اور
مسلمانوں کے سلسلے میں ہمارے دیش میں
ایک پاپ ہے۔ یہ پاپ ایک زمانے
سے چل رہا ہے۔ اِس کا جو نتیجہ ہے اُس
کو تو ہمیں بھگتنا ہی پڑے گا ......
ہمیں اب یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوؤں اور
مسلمانوں میں ایک اختلاف ہے۔ ہم
کئی صدیوں سے ایک دوسرے کے پڑوس
میں رہتے ہیں۔ ایک کھیت سے اناج
کھاتے ہیں، ایک ندی کا پانی پیتے ہیں،
ایک آفتاب سے اُجالا پاتے ہیں۔ ہم
کئی صدیوں سے ایک زبان میں گفتگو
کرتے ہیں، ہمارے دکھ سکھ ایک ہیں۔
اسکے باوجود پڑوسی سے پڑوسی کا جو
انسانی تعلق ہونا چاہیئے وہ ہم میں نہیں ہے

ہم جانتے ہیں کہ بنگال میں کئی جگہ ہندو
مسلمان ایک فرش پر بیٹھتے نہیں ہیں گھر
میں مسلمان آنے پر جاجم کا ایک حِصّہ
موڑ کر رکھ دیا جاتا ہے، حُقّہ کا پانی
پھینک دیا جاتا ہے ...... اگر یہی دھرم
اور شاستر کا اصول ہو تو اُس دھرم
یا شاستر کو لے کر سودیشی قومیت کبھی
قائم نہیں ہو سکے گی۔ جس ملک کے دھرم
کا اصول انسان سے نفرت کرنا ہو، پڑوسی
کے ہاتھوں پانی پینے سے جن کا مستقبل خراب
ہو جاتا ہے، غیر کو ذلیل کر کے جن کو اپنی
ذات کی حفاظت کرنی ہوتی ہے، اُن
کے لئے اسکے علاوہ چارہ ہی کیا ہے کہ وہ
غیر کے ہاتھوں بے عزت ہوں۔"

مذہبی تنگ نظری اور رسوم کے خلاف ٹیگور نے بار بار قلم
اٹھایا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"ہمارے ملک میں مذہب وہ بنیاد ہے جو
انسان کو انسان سے دُور کرتا ہے، پرکھا ہے

ہم بھگوان کا نام لے کر ایک دوسرے
سے نفرت کرتے ہیں۔ عورتوں کو قتل کرتے
ہیں، بچوں کو پانی میں پھینک دیتے ہیں،
بیواؤں کو بے قصور پیا سے جلاتے ہیں،
بے زر جانوروں کی قربانی دیتے ہیں، ہم
مذہب کے نام پر اس خوف سے کہ کہیں
ذات نہ چلی جائے۔ ایسے مرد کو ہاتھ
تک نہیں لگاتے جس کو ہم پہچانتے نہ ہوں
یا جس کے ذات پات سے ہم آگاہ نہیں
ہوں ...."

ٹیگور نے بار بار یہ کہا ہے کہ مذہب ہمارے تمام اختلافات کی جڑ ہے اور ہماری ترقی کے راستے میں سب سے اہم رکاوٹ ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"جس ملک میں خاص کر مذہب کا بندھن
ہی انسانوں کو باندھے رکھتا ہے، جہاں
دیگر کوئی بندھن اُن کو ایک ساتھ نہیں
رکھ پاتا۔ وہ ملک نہایت ہی بدقسمت ہے
اُس ملک میں مذہب کی بنیاد پر جو اختلافات

پیدا ہوتے ہیں اور یہی اختلافات سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ درحقیقت "انسانیت" کا نام مذہب ہونا چاہیئے، جہاں انسان کو بطور انسان ہی پہچانا جائے۔ جس ملک میں مذہب اسی "انسانیت" پر چھا جائے اور انسانی عقل پر حملہ کرے، کیا اُس ملک کو سیاست بچا سکتی ہے؟ یہ بات تاریخ میں بار بار دیکھنے میں آئی ہے کہ جب کسی عظیم قوم میں حیاتِ نو کی تعمیر کے لئے کوئی سیاسی انقلاب آیا ہے اُس وقت اُس انقلاب کے ساتھ ساتھ وہاں کے مذہبی خیالات اور اصولوں پر سخت چوٹیں پڑی ہیں۔ مذہب سے نفرت کے شعلے بھڑکے ہیں۔ انقلاب فرانس اسکی مثال ہے۔ سوویت روس بھی مذہبی فلسفہ اور اصولوں کا سخت مخالف ہے۔ حال میں اسپین میں بھی مذہب کے خلاف شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ میکسیکو کے انقلاب میں بار بار مذہب کے قلعے پر حملہ ہوا ہے"۔

اقبال نے کہا ہے کہ "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" لیکن ٹیگور کہتے ہیں کہ مذہب بیر رکھنا سکھائے یا نہ سکھائے، عملی طور پر مذہب ہی بیر کی جڑ ہے۔ بہر حال ٹیگور کے خیالات واضح طور پر اعلان کرتے ہیں کہ وہ انسان دوست تھے۔ انسانیت کے پجاری تھے اور تمام تر مذہبی تنگ نظری سے کوسوں دور تھے۔

اقبال مسلمان تھے اور "اسلامی شاعر" تھے۔ گزشتہ صفحات میں اقبال کے ایسے خیالات سے چند اقتباسات پیش کئے گئے ہیں اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ اقبال کے مطابق "دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصوّر کے یکجا" نہیں رہ سکتا چونکہ بقول اقبال اس کا نتیجہ "لادینی" ہی ہوگا۔ ان باتوں کے باوجود خاص کر اقبال کے ابتدائی تخلیقات میں ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال نے دیگر مذاہب کا خوب احترام کیا ہے۔ متحدہ قومیت کے خلاف اقبال کے سیاسی افکار کے باوجود وہ عظمتِ انسانی کے بہت بڑے طرفدار رہے ہیں۔ ابتدائی دور میں انھوں نے شری کرشن۔ رام۔ گوتم بدھ اور گرونانک وغیرہ کو عقیدت پیش کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ اعلان کرتے ہیں [illegible] ہمہ گیری

تنگ نظری سے اقبال کا دامن پاک تھا۔ اُن کی مشہور نظمیں مثلاً ہمالہ، بچے کی دعا، تصویرِ درد، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ ادر آفتاب (ترجمہ گایتری) وغیرہ، وہ نظمیں ہیں جن میں اُن کی وطن دوستی غیر فرقہ وارانہ جذبات اور ہندو مسلم اتحاد کا بھر پور جذبہ پایا جاتا ہے۔ سری کرشن کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:-

"بنی نوع انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب پیرائے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ ترکِ عمل سے مراد ترکِ کلی نہیں ہے کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے بلکہ ترکِ عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اسکے نتائج سے مطلق دل بستگی نہ ہو۔ سری کرشن کے بعد شری رام نوج بھی اسی راستے پر چلے۔" (دیباچہ مثنوی اسرارِ خودی)

اور اقبالؔ نے رامؔ، گوتم بدھؔ، اور گرونانکؔ کے سلسلے میں ایسے اشعار کہے ہیں:-

ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اُس کو امامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

....

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی

....

پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے
(گرونانک)

۱۹۰۵ء میں پہلی بار انگریزوں نے تقسیم بنگال کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہی وہ منصوبہ ہے جو سیاسی لحاظ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ کرنے کا پہلا قدم رہا ہے۔ نواب ڈھاکہ سر سلیم اللہ خاں اس تقسیم کے حق میں تھے لیکن سودیشی تحریک کی کامیابی سے آخرکار انگریزوں کا یہ منصوبہ کامیاب

منتج ہوا اور دسمبر ۱۹۱۱ء میں انگریز حکومت کو اس تقسیم بنگال کے فیصلے کو رد کرنا پڑا۔ اسی زمانے سے بعض مسلم لیڈروں میں ہندوؤں سے الگ ہٹ کر مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کی حکومت یا مسلم اسٹیٹ قائم کرنے کا ابتدائی خیال اُبھرا۔ بقول عبدالمجید سالک مصنف "ذکر اقبال" اقبال بھی اس قسم کی تقسیم کے حق میں تھے اور جب "انگریز نے کچھ بنگالیوں کی سرکشی اور بم بازی سے متاثر ہو کر اور کچھ مسلمانوں کی تالیف قلوب کے لئے اعلان کیا کہ ہندوستان کا دارالسلطنت کلکتے سے دہلی میں منتقل کر دیا گیا۔ کیونکہ دہلی شاہان سلف کا صدر مقام ہونے کی حیثیت سے اس عزت کا مستحق ہے۔ اقبال نے بھی تقسیم بنگال کی تنسیخ پر تو دوسرے مسلمانوں ہی کی طرح صدمہ محسوس کیا۔ لیکن انگریز کی طرف سے اس کی تلافی کا کسی حد تک اعتراف کیا۔ چنانچہ انھوں نے عطیہ بیگم کو ایک خط میں لکھا کہ حکومت نے انتقال دارالسلطنت سے گویا بنگالیوں کی اہمیت گھٹا کر صفر کر دی ہے اور بنگالی سمجھتا ہے کہ اس کی جیت ہوئی ہے اس خط میں دو شعر بھی لکھے ہیں:۔

مندمل زخم دل بنگال آخر ہو گیا ، وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن گئی

تاج شاہی آج کلکتے سے دہلی آ گیا
مل گئی بابو کو جوتی اور بنگال ہی چھین گئی

اقبال سے نواب ڈھاکہ سر سلیم اللہ خاں کی ملاقاتیں بھی رہی ہیں اور غالباً پہلی بار دسمبر ۱۹۰۸ء میں ملاقات ہوئی تھی جب انجمن کشمیری مسلمانان کے ایک وفد کے ساتھ اقبال نے نواب صاحب سے ملاقات کی اور نواب موصوف نے انجمن کا سرپرست ہونا منظور کیا۔ انگریزوں نے تقسیم بنگال کے منصوبے کی ناکامی کے بعد ہی نواب ڈھاکہ کو "سر" کا خطاب عطا کیا تھا۔

تحریک ہمہ اسلامیت Pan-Islamism سے متاثر ہونے سے قبل اور عملی طور پر مسلم لیگ کی سیاست سے رشتہ جوڑنے سے قبل اقبال کے خیالات میں حب الوطنی کے بھرپور جذبے تھے اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ مسلم لیگی سیاست میں آنے کے بعد انھوں نے مسلمانوں کے لئے ایک الگ حکومت کی تجویز (۱۹۳۰ء) میں پیش کی تھی۔ اُس تجویز میں کہیں بھی پاکستان کا لفظ نہیں آیا ہے اور نہ ہی اُن دنوں انگریز سے مکمل آزادی کا نعرہ بھی انھوں نے لگایا تھا۔ اُس وقت تک انگریزوں سے مکمل آزادی حاصل کرنے کا کوئی

منصوبہ سامنے نہیں آیا تھا لہٰذا اُس تجویز میں انگریزی حکومت یا برٹش سامراج کے تحت ہی مسلمانوں کے لیئے ایک اسٹیٹ کی مانگ کی گئی ہے۔" ہندوستان چھوڑدو" کی تجویز اگست ۱۹۴۲ء میں کانگریس نے منظور کیا یعنی مکمل آزادی کا مطالبہ سیاسی طور پر ۱۹۴۲ء ہی میں کیا گیا ہے۔

اقبالؔ نے بھی مذہب کے ٹھیکیداروں (ملا اور پنڈتوں) پر سخت چوٹیں کی ہیں۔ مولویوں کے خلاف وہ لکھتے ہیں "مولوی صاحبان کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی شہر میں اتفاق سے دو جمع

ہو جائیں تو حیاتِ مسیح یا آیاتِ ناسخ و منسوخ پر بحث کرنے کے لیئے باہمی نامہ و پیام ہوتے ہیں اور اگر بحث چھڑ جائے اور بالعموم چھڑ جاتی ہے تو ایسی جوتیوں میں دال بٹتی ہے کہ خدا کی پناہ ـــ پرانا علم و فضل جو علماء اسلام کا خاصہ تھا نام کو بھی نہیں۔ ہاں مسلمان کافروں کی ایک فہرست ہے کہ اپنے دستِ خاص سے اُس کو روز بروز اضافہ کرتے رہتے ہیں ـــ"

(قومی زندگی۔ اقبالؔ)

اس سلسلے میں علامہ اقبال کے دو چار شعر بھی سُن لیجئے۔

ہم کو تو میسّر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اسکو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

نذرالاسلام کے یہاں قرآن، پُران، وید، انجیل وغیرہ کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنی کہ دِلِ انسان کی رہتی ہے۔ اُن کا پیغام یہی تھا کہ ہر سوال کو ٹھنڈے دماغ سے دِل کی کسوٹی پر پرکھو، دِل سے، گہرے دل سے سوال کرو، دِل کیا کہتا ہے دِل میں سارے جہاں کا درد پیدا کرو، انسانیت سے پیار کرو۔ وہ مذہب، رسم ورواج، ذات پات، اونچ نیچ، رنگ ونسل وغیرہ وغیرہ کے تمام بندھنوں کو توڑ چکے تھے۔ وہ "شاعرِ مساوات" تھے۔ ہر معاملے میں مساوات کے قائل تھے

اُن کا پیغام مساوات اور صرف مساوات اور مکمل مساوات ہے۔ چند اشعار دیکھیے :۔

کون پوچھتا ہے ــــ کہ
ہندو کون ہے اور مسلمان کون ہے ۔؟
اے ناخدا ، کہہ دے ــــ کہ
جو انسان غرق ہو رہے ہیں
وہ سب مادرِ گیتی کی اولاد ہیں

(ناخدا)

میں اُس مساوات کے گیت گاتا ہوں
جہاں پہونچ کر
سب اختلافات اور تفرقے مِٹ جاتے ہیں
جس کے سائے میں
ہندو اور بودھ ، مسلمان اور عیسائی ہمدوش ہو جاتے ہیں
میں اُسی مساوات کا نغمہ سنج ہوں

تم کیا ہو ــــ ؟
پارسی ، جین ، یا یہودی
بولو تو سہی کیا ہو ــــ ؟

تم جو کچھ بھی ہو تمہاری مرضی ہے
پیٹھ پر تم خواہ کتنی ہی کتابوں کا بار لادے پھرو
قرآن، پُران، انجیل، وید
تمہارا جی چاہے تو گھول کر پی جاؤ
لیکن یہ تو کہو اِس دردِ سر سے مُدعا کیا۔؟
ان کاغذی پھولوں پر جان کیوں دیتے ہو۔

وہ دیکھو ——
باغ جہاں میں چمن بندی ہو رہی ہے
سارے زمانے کے علم کو کھنگالنے والو۔
ذرا کتابِ دل کی طرف بھی تو ایک نظر دیکھ لو
تمہیں اپنے نفس میں دینِ حق کا چراغ جگمگاتا ملے گا
اور —— تمہارا دِل وہ کعبہ ہے
جو بنی نوعِ انسان کا قبلہ نما ہے
مردہ دیوتاؤں اور فرسودہ کتابوں کی تلاش میں
ناحق مارے مارے پھرتے ہو
دیر و حرم، کعبہ و کلیسا، سب کچھ اِسی دل میں ہے
سچ جان —— کہ
اِس دل سے بڑی کوئی سجدہ گاہ نہیں ہے۔ (راشٹرواد)

اے بہادر، مت گھبرا
پنڈتوں سے، مذہب کے ٹھیکہ داروں سے
یہ لوگ،
خدا کے پرائیویٹ سکریٹری نہیں ہیں۔

ساتھی ــــ!
تم مذہبی کتابوں کو چھوڑو ــــ اور
حق کے اِس گہرے سمندر میں غوطہ لگاؤ

(الیشور)

کل مسجد میں کہیں سے کھانا آیا تھا
پلاؤ قورمہ کی رکابیوں کو
مُلّا للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا
اُسی وقت ایک مسافر آیا
جس کا جسم تھکان سے چور چور ہو رہا تھا
بولا ــــ "بابا، کئی روز سے فاقہ کر رہا ہوں ــــ"
مُلّا نے دیدے نکال کر کہا ــــ "مردود ــــ
یہ تیرے گناہوں کی سزا ہے
کبھی نماز بھی پڑھتا ہے ــــ"!

بھکاری نے کہا ——— "جی نہیں ——"
مُلّا نے چیخ کر کہا ——— "ملعون، نکل خدا کے گھر سے ——"
یہ کہہ کر مسجد میں، اُس نے قفل جڑ دیا
فقیر نے آہ بھر کر کہا ———
"یارب اسّی سال کی مدّت میں میں نے تجھے،
کبھی یاد نہیں کیا ——— تاہم
میری روٹیوں پر تُو نے پابندی نہیں لگائی
تیرے مندر و مسجد پر
انسان کا کیا اختیار ہے ——— ؟
پنڈتوں اور ملّاؤں نے اُن پر قبضہ کیوں کر رکھا ہے ——"؟

قرآن، وید اور انجیل کو
چوم چوم کر یہ کمبخت مرے جاتے ہیں
یہ نا سمجھ ———
کتابوں کی پرستش کرتے ہیں۔
کوئی اُنھیں بتلائے ——— کہ
انسان کتابیں بناتا ہے
کتابیں انسان پیدا نہیں کر سکتیں ـــ اور

اُن مردہ کتابوں کے صدقے میں
زندہ انسان ایک دوسرے کا خون پی رہے ہیں۔
(انسان)

(۶)

نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے اِن تینوں شعراء میں کبھی کوئی ملاقات نہیں ہو پائی۔ ٹیگور، اقبالؔ اور نذرؔل کبھی یکجا نہیں ہوئے، مل کر نہیں بیٹھے اور نہ ہی کسی مسئلہ پر اُن میں تبادلہ خیال ہوا ہے۔ نذر الاسلام اور ربندر ناتھ ٹیگور دونوں چونکہ بنگلہ زبان کے شاعر تھے اور بنگال ہی میں رہتے تھے لہٰذا وہ ملے اور خود ٹیگور نے نذر الاسلام کے کلام کی تعریف بھی کی ہے۔ لیکن ایک تو اقبالؔ اردو و فارسی کے شاعر تھے جن زبانوں سے ٹیگور کو کوئی علم نہیں تھا۔ دوسرا یہ کہ اقبالؔ پنجاب میں رہتے تھے۔ نذر الاسلام تھوڑا بہت اردو جانتے تھے لیکن اب تک کی تحقیق کے مطابق انھوں نے بھی اقبالؔ کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اب تک اِن شعراء کے سلسلے میں جو بھی

تحقیقی کام ہوا ہے اُسکے مطابق کبھی ان شعراء کے درمیان خط وکتابت بھی نہیں ہوئی ہے۔

اکبر رحمانی جلگانوی کے مطابق[1] ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ حیدرآبادی (جو ٹیگور اور اقبالؔ دونوں سے گہری عقیدت رکھتے تھے اور خود بھی اردو، فارسی اور انگریزی میں شعر کہتے تھے اور ساتھ ہی اقبالؔ اور ٹیگور سے جن کی خط وکتابت تھی) نے ٹیگور اور اقبالؔ کی ملاقات کرانے کی بھی کوشش کی تھی۔ انھوں نے لکھا ہے:— "جب ٹیگور لاہور تشریف لے جارہے تھے ڈاکٹر لمعہ نے ٹیگور کو ایک خط لکھا اور اُن سے فرمائش کی کہ وہ لاہور میں اقبالؔ سے ضرور ملیں۔ ٹیگور لاہور پہنچے تو وہ اقبالؔ کی مزاج پرسی کے لیئے اُن کے گھر گئے۔ اتفاق سے علامہ اقبالؔ اُس وقت لاہور میں موجود نہ تھے۔"

اقبالؔ کے سلسلے میں ٹیگور کے صرف دو بیانات (ایک خط ڈاکٹر لمعہ کے نام اور دوسرا اقبالؔ کی موت پر خراج عقیدت) ہی ملتے ہیں۔ ٹیگور کے خط سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ

---

[1] "اردو ڈائجسٹ" اقبالؔ صدی نمبر اگست ۱۹۷۷ء

اقبال کی شہرت سے آگاہ تھے اور ایک نامور ہستی ہونے کی وجہ سے ضروری احترام کرتے تھے۔ لیکن ٹیگور اس سلسلے میں حق گو ہیں اور صاف کہتے ہیں[1] ۔ "اُن زبانوں سے جن میں اقبال شعر کہتے ہیں ناواقفیت کی بنا پر، اُن کی قوتِ تخلیق کی گہرائیوں تک نہ تو میری رسائی ممکن ہے اور نہ ہی میں اُن کے کلام سے متعلق کوئی رائے پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ لیکن اقبال کی نظموں کو جو شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی ہے اُس کی بنا پر مجھے یقین واثق ہے کہ اقبال کے اُن جواہر پاروں میں ادبِ جاوداں کی عظمت و تابنا کی موجود ہے"۔

کسی کی موت پر فوری طور پہ جو باتیں کہی جاتی ہیں، افسوس اور رنج و غم کا جو اظہار کیا جاتا ہے، ادب میں اُس کی اہمیت اِس لحاظ سے کم ہوتی ہے کہ وہ بیانات یا تعزیتی پیغامات وقتی اور زیادہ تر رسمی ہوتے ہیں۔ اِسلئے ٹیگور نے بھی اقبال کے موت پر جو کہا وہ میرے خیال سے کوئی ادبی اہمیت نہیں رکھتا۔ اسی طرح اقبال نے بھی ٹیگور اور اُن کی شاعری وغیرہ کے سلسلے میں کچھ نہیں کہا۔ کہنا ہی زیادہ درست ہے۔ اقبال

---

[1] "ہما" اردو ڈائجسٹ اقبال صدی نمبر اگست ۱۹۷۷ء اس خط کی تاریخ ۲ فروری ۱۹۳۳ء ہے۔

کے ایک دو خط میں ٹیگور کا نام آیا ہے لیکن اِس سے ٹیگور کے خیالات کے سلسلے میں اقبالؔ کا کوئی خیال سامنے نہیں آتا۔

اقبال اور نذرالاسلام میں کبھی کوئی ملاقات یا خط وکتابت کا ہمیں علم نہیں ہے۔ ڈاکٹر سید اختر حسین رائے پوری نے نذرالاسلام کی چند نظموں کا ترجمہ اقبالؔ کو دکھایا تھا اور بقول اختر حسین رائے پوری —"وہ (اقبالؔ) بہت خوش ہوئے اور بہت دیر تک نذرالاسلام کا ذکر کرتے رہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمائش کی کہ انھیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ افسوس کہ اقبالؔ آج ہم میں نہیں ہیں۔ وہ نذرالاسلام کے خیالات کے سخت مخالف تھے لیکن اسکے شاعرانہ کمال کے بڑے معترف تھے"۔[۱]

سلیم اللہ فہمی رقمطراز ہیں[۲] —"یادِ اقبالؔ کے مؤلف غلام سرور فگار کو علامہ اقبالؔ کی خدمت میں اکثر و بیشتر حاضر رہنے کا شرف حاصل تھا۔ فگار کو نذرالاسلام کے ترجموں

۱؎ مقدمہ "پیامِ شباب" از سید اختر حسین رائے پوری

۲؎ "مشرق" سلیم اللہ فہمی صفحہ ۱۱۳-۱۱۴ سالہ ۱۹۵۲ء

سے جو اُن دنوں "ساقی" اور دیگر رسالوں میں شائع ہو رہے تھے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ ایک دن فنکار نے علامہ اقبال کو نذرالاسلام کی نظم "نوجوان سے خطاب" کے شائع شدہ ترجمے کا ایک حصّہ سُنایا۔ اقبال بہت متاثر ہوئے اور اُن کی زبان سے یہ جملہ بے اختیار نکل آیا ——
"اس نظم کے زورِ بیان اور جوشِ آفریں معانی نے نہ جانے بنگالہ کے نوجوانوں کے جذبات اور احساسات کی دنیا میں کس حد تک زندگی کی روح پھونک دی ہو گی ——"

نذرالاسلام نے جب بنگلہ شاعری کے میدان میں قدم رکھا تب بنگلہ ادب میں ٹیگور کا آفتاب بلند تھا اور تمام ادبا و شعراء اُن کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ٹیگور کے راہِ ادب اور رنگ بیان سے ہٹ کر کسی نئی راہ کی تلاش تو دُور کی بات ہے، سوچا تک نہیں جا سکتا تھا۔ پھر بھی دیگر چند ممتاز شعراء مثلاً کرونا ندھن مکھرجی، جتیندر موہن باگچی، ستیندر ناتھ دت، گوبند داس موہت لال مجومدار اور جتیندر ناتھ سین وغیرہ نے کچھ کامیاب کوشش کی ہے اور عہد ٹیگور میں اُن کی زندگی کی وجہ بھی یہی ہے۔ نذرالاسلام نے بھی ابتداء میں ٹیگور کی تقلید کی۔

اور اُن کے رنگ میں نظمیں کہی ہیں لیکن بہت جلد وہ بنگلہ ادب میں ایک نئی راہ نکالنے اور انقلاب کا پُرزور ترانہ گا کر اپنے لیئے جداگانہ مقام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

ٹیگور اور اقبالؔ کا ادب بہت بڑی حد تک شرفاء، متوسط طبقہ یا تعلیم یافتہ لوگوں کا ہی ترجمان رہا ہے۔ اقبالؔ کی زبان سادہ زبان نہیں ہے حکیمانہ رنگ نے اُن کے کلام میں ایسے الفاظ لائے ہیں جو عام لوگ سمجھ نہیں پاتے بلکہ اقبالؔ نے کافی دقیق الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ لہذا اقبالؔ کے کلام سے لطف اٹھانے کے لیئے زبان کا گہرا علم ہونا بھی ضروری ہے۔ خزانہ الفاظ کے علاوہ اُن کے تلمیحات و اشارات، تشبیہات و استعارات کو سمجھنا بھی مشکل ہے اور اسکے لیئے وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔ ٹیگور کا حال بھی اِس سلسلے میں کچھ زیادہ جُدا نہیں ہے اقبالؔ نے بعض وقت زورِ بیان کے لیئے بھی بھاری بھرکم الفاظ استعمال کیئے ہیں۔ ہاں ٹیگور کے کلام میں موسیقی اقبالؔ سے زیادہ ہی ہے، نرمی اور مٹھاس بھی زیادہ ہے لیکن جوشِ کلام کے لحاظ سے اقبالؔ ٹیگور سے آگے معلوم ہوتے ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیگور اور اقبالؔ دونوں نے

انگریزی حکومت سے ، غلامی سے ، سامراجیت سے عوام میں نفرت کا جذبہ پیدا کیا ، سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف باتیں کی ہیں اور ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے احساسات کو بیدار کیا ہے لیکن اُن کی شاعری کسانوں اور مزدوروں کے لئے نہیں رہی ہے اور نہ ہی ہماری آبادی کے اسی اکثریتی طبقہ کو اپنے ساتھ لے کر چلے ہیں ۔ پروفیسر محمد عبداللہ نے بھی ٹیگور ، اقبال اور نذرالاسلام کی تخلیقات کا نہایت خوبی سے مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے ،[۱]

"نذرالاسلام ، رابندر ناتھ اور اقبال
تینوں کو انسانیت سے والہانہ محبت
تھی ۔ تینوں نے انسانیت کے گیت گائے
فرق صرف یہ ہے کہ ربندر ناتھ اور
اقبال نے عوام سے دُور رہ کر انھیں
محبت کا پیغام سنایا ۔ مگر نذرالاسلام
نے دلدل میں پھنسے ہوئے انسانوں کے
قریب پہنچ کر انھیں نکالنے کی کوشش کی ۔

---

[۱] نذرالاسلام ـــ از پروفیسر محمد عبداللہ ،

اقبالؔ اور ٹیگور عوام سے اتنے قریب
نہیں جتنے کہ نذر الاسلام ہیں۔ اُنھوں
نے عوام کو اتنے پاس سے نہیں دیکھا
جتنے کہ نذر الاسلام، ربندر ناتھ اور
اقبالؔ میں تھوڑا بہت فرق بھی ہے۔
نذر الاسلام فلسفی شاعر نہیں، وہ صاف
گو اور عوامی شاعر ہیں۔ وہ فلسفیانہ
مسائل میں نہیں اُلجھتے۔ اقبالؔ اور
ربندر ناتھ فلسفی شاعر ہیں۔ مگر ربندر ناتھ
اتنے فلسفی نہیں جتنے کہ وہ شاعر
ہیں.......... ٹیگور کی شاعری، اُن کی
تشبیہات و استعارات، اُن کے
محاوروں اور کہاوتوں میں عام طور پر
ہند و تہذیب و تمدن کی ترجمانی ملتی ہے۔
دوسری طرف اقبال نے اپنی شاعری کو
صرف اسلامی جذبات و خیالات اور مذہبی
واقعات و سانحات کے لئے وقف کر دیا۔
مگر نذر الاسلام کی شاعری گنگا جمنا اور

دجلہ فرات کا سنگم ہے۔ یہاں ہندو اور
مسلمان دونوں فرقوں کی تہذیب و تمدن
کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ انھوں نے ہر
فرد بشر میں اپنے اپنے مذہب کی انقلابی
روح پھونک کر اس میں سیاسی اور
سماجی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔"

ٹیگور نے کھلے دل سے بنگلہ شاعری میں نوجوان انقلابی شاعر نذرل کا سواگت کیا ہے۔ جن دنوں نذرالاسلام نے جیل میں ظلم و ستم کے خلاف بطور احتجاج متواتر ۳۹ دنوں تک بھوک ہڑتال کی تھی تب ٹیگور نے یہ ضروری سمجھا کہ اس نوجوان شاعر کی زندگی کو بچا لیا جائے۔ ٹیگور نے خود اس سلسلے میں آگے بڑھ کر نذرل سے اپیل کی اور شیلانگ سے ٹیگور کا تار ملنے پر ——— (بھوک ہڑتال چھوڑیئے، ہمارے ادب کو آپ کی ضرورت ہے) ہی نذرل اپنی برت توڑنے پر تیار ہوئے حالانکہ اس سے قبل ملک کے کئی رہنما اس سلسلے میں کوشش کر چکے تھے لیکن نذرل نے کسی کی نہ سنی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نذرل کے دل میں بھی

ٹیگور کا کتنا احترام تھا۔ ٹیگور نے بھی نذرل سے محبت کے اظہار کے لئے اپنا ناول "بسنت" کو اُن کے نام سے معنون کیا ہے۔

اُردو شاعری پر کلام اقبالؔ کا جو زبردست اثر پڑا وہ صاف ہے۔ اگر اقبالؔ نہ ہوتے اور انھوں نے مقصدی نظموں کے ذریعہ راستہ ہموار نہ کیا ہوتا تو فوری طور پر ہمیں شاید شاعرِ انقلاب جوشؔ نہ ملتا۔ (حالانکہ اقبالؔ اور جوشؔ کے خیالات میں کئی بنیادی اختلافات ہیں) اور غالباً یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حفیظؔ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام بھی نہ ہوتا۔ لیکن کلام اقبالؔ کا کوئی اثر بنگلہ ادب پر نہیں پڑا۔ اُس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ کلام اقبالؔ کا کچھ زیادہ ترجمہ بنگلہ زبان میں آج بھی نہیں ہوا ہے۔ ہند و پاک کا غیر اردو داں طبقہ اقبالؔ کو بہت بڑی حد تک صرف اُن کی نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کی وجہ سے جانتے ہیں جو عرصہ تک قومی ترانہ کے طور پر مقبول رہا ہے۔ اِس سے زیادہ اقبالؔ کے سلسلے میں عام غیر اُردو داں طبقہ کو علم نہیں ہے۔ کلام اقبالؔ کے بیشتر ترجمے تقسیم ہند کے بعد مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں کیا گیا ہے چونکہ اقبالؔ کو شاعرِ پاکستان

قرار دیا گیا۔ اسلئے مشرقی پاکستان میں عموماً کلام اقبال پر بنگلہ زبان میں کام ہوا ہے۔ اقبال کی نظم "شکوہ" ہی وہ ہے جس کے متعدد ترجمے تقسیم ملک سے پہلے (اور بعد میں بھی) بھی بنگلہ میں ہوئے ہیں۔ اقبال کا دور وہ دور تھا جب بنگلہ ادب میں ٹیگور اور نذر الاسلام جیسے شاعر موجود رہے ہیں جن کے ہوتے ہوئے کسی اور شاعر اور وہ بھی غیر زبان کا شاعر، کے اثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

اسکے برعکس ٹیگور اور نذر الاسلام کی تخلیقات کا تھوڑا بہت اثر اردو ادب پر ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستانی ادب پر ہوا ہے۔ اُس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر سے جدید ہندوستان کی سیاسی اور تمدنی مرکز ہونے کا شرف بھی بنگال ہی کو حاصل رہا ہے چونکہ یہیں انگریزوں کے قدم آکر جم پائے اور مغربی علوم و فنون کا چرچہ بھی پہلے پہل یہیں بیشتر ہوا ہے۔ کلکتہ چونکہ دار الحکومت تھا اسلئے پورے ہندوستان سے لوگ یہاں آتے رہے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے کلکتہ پورے ہندوستانی تمدن کا ایک سنگم بن گیا۔ ان سماجی وجوہات کی بنا پر مقامی زبان بنگلہ کے ادب نے نمایاں

ترقی کی اور اُس میں کئی نامور اہلِ قلم اِس عہد میں پیدا ہوئے جن کا اثر تمام ہندوستانی زبانوں کے جدید ادب پر ہوا۔ ناول اور افسانوں کی دنیا میں اگر بنکم چندر چیٹرجی اور سرت چندر چیٹرجی کا اثر نمایاں طور پر پڑا تو شاعری پر ٹیگور اور نذر الاسلام کی تخلیقات کا اثر ہوا ہے۔

ٹیگور کو نوبل انعام ملنے پر اُن کی شہرت عالم گیر ہو گئی اور اُسی زمانے میں نیاز فتح پوری نے انگریزی سے گیتا نجلی کا اردو میں "عرضِ نغمہ" کے نام سے ترجمہ کیا۔ ایک غلام ملک کے شاعر کو نوبل انعام کا ملنا۔ دنیائے ادب کے لئے بہت بڑی بات رہی ہے۔ اِس خبر نے ایک ہلچل مچا دی تھی۔ خود نیاز فتح پوری لکھتے ہیں [1] "جس وقت اوّل اوّل مجھے اس حقیقت شناس کا حال معلوم ہوا تو میں متحیر رہ گیا کہ خدایا ٹیگور نے کس شیریں کی زبان میں شاعری کی ہے جو یورپ یوں بے اختیار ہو گیا اور مجھے جستجو ہوئی کہ کوئی نظم ملے تو دیکھوں لیکن افسوس ہے کہ میں ایک عرصہ تک اس آرزو میں تڑپتا رہا اور آخر

---

[1] گیتا نجلی (عرضِ نغمہ) نیاز فتحپوری کے مقدمہ سے جو ۲۲ مئی ۱۹۱۴ء کا ہے۔

جب اُس کے مجموعۂ نظم "گیتان جلی" کا انگریزی ایڈیشن شائع ہو کر مجھ تک پہونچا اور میں نے اپنے بیتاب ہاتھوں سے اُسے کھول کر...... مطالعہ کیا۔"

نیاز صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۔۔۔ "ابھی زمانے میں ٹیگور کی گیتانجلی انگریزی میں شائع ہوئی تھی اور وہ مجھے اس قدر پسند آئی کہ میں نے فوراً اُس کا ترجمہ "عرضِ نغمہ" کے نام سے شائع کر دیا[1]۔ اور ٹیگور کے طرزِ تحریر تو نہیں لیکن اس کی معنویت سے ضرور میں نے اپنے بعض مضامین میں استفادہ کیا ہے[2]۔" جدید اُردو نثر میں رومانیت پر قلم اٹھاتے ہوئے مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے ۔۔ "اس وقت ہندوستان کا ادب خاص

رومانی میلان کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یہ بڑھتی

ہوئی رومانیت ایک طرف تو مغربی ادبیات

کے مطالعہ کا نتیجہ تھی دوسری طرف خود اپنے

---

1. نیاز فتحپوری کے علاوہ گیتانجلی کے اردو مترجمین میں برج چندر کا ترجمہ بھی مشہور رہا۔ جس کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۲۳ء میں اور پانچواں ایڈیشن جو میرے پاس ہے، مارچ سنہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔

2. نگار پاکستان۔ نیاز نمبر حصہ اول سنہ ۱۹۶۳ء

ملک کی متصوفانہ رومانیت اس کی ذمہ دار ہے..... یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ٹیگور کے ساتھ ساتھ انگریزی کے مشہور شعراء اور مصنفین بالخصوص عہد وکٹوریہ کے آخری دور کے ادیبوں کا اثر روز بروز اُردو ادب میں مقبول ہو رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ اُردو میں اس عجیب و غریب صنفِ نثر کا سودا ہر لکھنے والے کے سر میں سمایا ہوا تھا جس کو شعر منثور یا شاعرانہ نثر کہتے ہیں۔ ہندوستان میں اس کی ابتداء ٹیگور سے ہوتی ہے[1]؎"

سلیم احمد بھی رقم طراز ہیں[2]؎ کہ جوش کی کئی نظموں پر "ٹیگوریت کا اثر نمایاں ہے لیکن خارجی" خود جوش لکھتے ہیں کہ وہ[3]؎ ابتداء میں شرر اور سرشار کی نثر اور داغ اور انیس کی شاعری سے متاثر ہوا۔ آگے بڑھا تو مومن، میر، غالب اور نظیر اکبر آبادی نے

---

[1]؎ نگار پاکستان۔ نیاز نمبر حصہ اول ۱۹۶۳ء

[2]؎ اور [3]؎ رسالہ نیا دور کراچی شمارہ ۴۳، ۴۴ مضمون "جوش اور آدمی"

متاثر کیا۔ پھر ٹیگور یت نے دل میں گھر کیا۔ اسکے بعد اقبال آئے لیکن چھا نہ سکے ۔"

سید احتشام حسین نے "اردو ادب پر ٹیگور کا اثر" کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے [۱]

"اردو ادب پر ٹیگور کے اثرات کا اندازہ لگانا اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے۔ اصل اثر ہمیشہ گہرا ہوتا ہے اور غیر محسوس طور پر کام کرتا ہے اور ان لوگوں کے شعور کا جز بن جاتا ہے جن کے ذریعے وہ پھیلتا اور ظاہر ہوتا ہے .... اس وقت اردو کے ادیبوں میں دو بہت ہی ہونہار جوان ادیب تھے ایک نیاز فتحپوری دوسرے مرحوم ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری۔ یہ دونوں ادیب انگریزی گیتانجلی کی رنگینی، رعنائی، فصاحت اور اثر انگیزی سے

---

[۱] اردو ادب پر ٹیگور کا اثر۔ از سید احتشام حسین۔ ماہنامہ "کتاب نما" دہلی نومبر ۱۹۶۲ء سے جس میں یہ مضمون "کتابی دنیا" کراچی کے حوالے سے شائع ہوا ہے۔

مسحور ہو گئے۔ اُردو کا رحجان رومانیت کی طرف تھا، اسلیئے ان نغموں میں جادو بھرے الفاظ کے پیچھے جو جذباتی زور اور خلوص تھا اس نے انھیں اپنا گرویدہ بنالیا۔ نیاز ان کی ماورائی عظمت اور ادبی سحر کاری سے اور بجنوری ان کی فلسفیانہ معنویت اور اظہار کی بلندی سے متاثر تھے ...
...... تاہم پریم چند کے دیہات، ان دیہاتوں کے سیدھے سادے باسی، اُن کے مزاجوں کی انوکھی خصوصیت اور افسانے کے مختصر ڈھانچے میں وحدت تاثر پیدا کرنے کا فن، سب ٹیگور سے مماثلت رکھتے ہیں ...... اُردو میں رومانی میلانات، جنہیں روایت پرستی اور بعض قسم کے سماجی اور سیاسی حالات کے ردِعمل کے طور پر بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں نمایاں ہو گئے تھے۔ ان کے اثر سے وہ اسلوب عام ہوا جسے ادب لطیف کہا گیا ہے خلیق دہلوی۔ میاں بشیر احمد۔ جوش۔ سجاد انصاری۔ ساغر نظامی اور بعض دوسرے ادیبوں

نے رسائل اور کتابوں کے صفحات پر اپنے جذبات کا رقیق سیال بہا دیا۔ دوسری تحریروں کے علاوہ خلیقی کی ادبستان، جوش کی روحِ ادب کا نثری حصہ سجاد انصاری کے محشرِ خیال کے کچھ مضامین، میاں بشیر احمد کی طلسم حیات مثال میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان ادیبوں نے بہت واضح طور سے ٹیگور کے اثر کا اعتراف نہیں کیا ہے۔ لیکن ان میں ایسی اندرونی شہادتیں موجود ہیں کہ اس پر یقین کرنا ناگزیر ہے جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس میں جوش۔ درگا سہائے سرور، افسر میرٹھی، اختر حیدر آبادی اور بعض دوسرے شعراء پر ٹیگور کا اثر، خیالات اور اندازِ بیان دونوں نمایاں ہے ....

۱۹۳۰ء تک ٹیگور کی تصانیف کے بہت سے ترجمے اردو میں ہونے لگے تھے۔

ان میں شانتی نکیتن کے مرحوم ضیاء الدین کا وہ ترجمہ بھی تھا جو انھوں

نے براہِ راست بنگالی[1] سے کیا تھا اور کلام ٹیگور کے نام سے وشوا بھارتی سے شائع ہوا تھا۔ چترا۔ سنیاسی، ہگار ڈنر وغیرہ کے ترجمے بھی ہو چکے تھے۔ مخدوم محی الدین نے اسی زمانے میں اپنی قابل قدر کتاب "ٹیگور اور اُن کی شاعری" شائع کی تھی۔ اُس وقت اردو ادب ایک ایسے دور میں داخل ہو رہا تھا جسے انقلابی رومانیت کہہ سکتے ہیں۔ اس میں مسائل حیات کی حقائق پسندانہ اور مثالی تعبیریں گھُلی ملی تھیں۔ اور ترقی پسندوں کا ایک گروہ ٹیگور کے مابعد الطبیعاتی اثرات کو زندہ اور جہد آزادی میں کام آنے والے ادب کے لئے مضر سمجھتا تھا۔ اس مسئلہ پر نوجوان ادیبوں میں زبردست اختلاف رائے تھا۔ لیکن اس بات کو سب تسلیم کرتے

---

[1] زبان کو بنگالی کہنا میرے خیال سے غلط ہے۔ زبان کے لئے لفظ بنگلہ کا استعمال زیادہ درست ہے اور بنگلہ جن لوگوں کی مادری زبان ہے اُن کو بنگالی کہا جاتا ہے۔ (مصنف)

ہیں کہ ہندوستان کے تصور انسانیت کے سب سے اچھے ترجمان ٹیگور ہی ہیں ۔۔۔"

بہر حال اُردو ادب کے اس دور کا جس دور میں ادب لطیف کی تحریک چلی جو کہ ایک جمالیاتی تحریک تھی اور جس اندازِ بیان کو اردو ادب میں شعرِ منثور، شاعرانہ نثر یا رومانیت وغیرہ کہا گیا ہے، پر ٹیگور کا گہرا اثر رہا ہے حالانکہ یہ دور نہایت مختصر ہے اور اردو ادب میں یہ دور زیادہ سے زیادہ بیس سال تک برقرار رہا ہے لیکن نیاز فتحپوری سے لے کر ل۔ احمد اکبرآبادی تک اس جمالیاتی تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ اسی طرح ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ نذرالاسلام کے کلام کا ترجمہ اُردو کے ادبی رسائل میں شائع ہونے لگا اور اردو والوں نے ایک "باغی" کی للکار سنی۔ اس للکار کا بھی اثر اُردو کے شعرا نے قبول کیا۔ پرویز شاہدی یونس احمر اور احسن احمد اشک تک شعرائے اُردو کا ایک سلسلہ ہے جن کے کلام پر نذرالاسلام کی چھاپ پائی جاتی ہے۔

عورت

اقبال کی نظر میں

رقص و سرود ہو، گیت یا نغمہ ہو، مصوری ہو یا سنگ تراشی — تمام فنونِ لطیفہ میں روزِ اوّل ہی سے عورت کو مرکزی اہمیت اور نمایاں بھرپور مقام حاصل رہا ہے۔ ہر زبان کے ادب میں عورت کی یہ مرکزی اہمیت مسلّم ہے۔ چاہے وہ شعری ادب ہو یا نثری ادب۔ خاص کر شاعری اور وہ بھی اُردو شاعری جس کی جان غزل کہلاتی ہے، کی تعریف ہی "عورتوں سے باتیں کرنا" ہے۔ پھر کوئی شاعر، شاعر ہوتے ہوئے اِس ہر دلعزیز محبوبہ یعنی عورت سے اپنے آپ کو کہاں تک بچا سکتا ہے؟ اُردو کے شعراء نے محبوبہ کی کمر کو کن کن نظروں سے نہ دیکھا، صرف کمر ہی کیوں، سر سے پاؤں تک اُس کے ہر انگ کو ہزاروں ڈھنگ سے دیکھا، بار بار دیکھا اور پھر اُس کی مسکراہٹ، چال، ادائیں اور اندازِ گفتگو وغیرہ وغیرہ پر

لاتعداد اشعار نچھاور کر ڈالے۔ فنکاروں کی اِسی حالت پر ماتم کرتے ہوئے ہی اقبالؔ نے کہا تھا:۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

لیکن اِسکے باوجود اقبالؔ نے خود اِتنا تسلیم کیا۔

"وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ"

لیکن شاعر اقبالؔ نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا اور بقول اقبالؔ شاعری اور فنِ شاعری سے اُس کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اقبالؔ نے کئی خطوط میں شاعر نہ ہونے کا صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ مثلاً

"میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصدِ خاص عزیز رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اِس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے .... شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر

نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو جائے بس۔"

(خطوط بنام سید سلیمان ندوی)

"میری غرض شاعری سے زبان دانی کا اظہار یا مضمون آفرینی نہیں، نہ میں نے آج تک اپنے آپ کو شاعر کہا ہے۔ حقیقت میں فن شاعری اس قدر دقیق اور مشکل ہے کہ ایک عمر میں بھی انسان اس پر حاوی نہیں ہو سکتا، پھر میں کیونکر کامیاب ہو سکتا ہوں...... میرا مقصود گاہ گاہ نظم لکھنے سے صرف اس قدر ہے کہ چند مطالب جو میرے ذہن میں ہیں اُن کو مسلمانوں تک پہونچا دوں۔"

(بنام محمد دین فوق)

مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ صاف ہے کہ اقبال لوگوں سے کچھ کہنا (اقبال نے لوگوں کے بجائے "مسلمانوں" کہہ کر اپنے کو محدود کر لیا ہے) کہنا چاہتے تھے اور چونکہ لوگ نثر سے زیادہ نظم پسند کرتے تھے اسلئے انھوں نے "اس

ملک کے حالات وروایات" کے مطابق نظم میں کہنے کا طریقہ اختیار کیا، اور آج ہم اقبالؔ کو ایک عظیم شاعر تسلیم کرنے پر مجبور ہیں چونکہ شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے ہمیں جو کلام دیا ہے وہ اردو شاعری میں کئی لحاظ سے قابلِ قدر اضافہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس شاعر اور وہ بھی مفکرؔ شاعر نے عورت کو کس نظر سے دیکھا ہے۔؟

ایک عورت ہزار روپ، عورت ماں ہے، بیوی ہے، بہن ہے، بیٹی ہے، محبوبہ ہے، عورت شکتی بھی ہے اور شانتی بھی، آگ بھی اور پانی بھی، شعلہ بھی شبنم بھی۔ انسانی آبادی میں اُس کا نصف حصہ ہے یعنی وہ نصف جہاں ہے۔ اگر عورت میٹھی میٹھی لوریاں سنا کر مدھر مدھر گیت گا کر ہمیں آرام و سکون عطا کرتی ہے، راحت بخشتی ہے، تو عورت ہمیں ٹھوکریں مار کر، جھنجھوڑ کر، عزت وآبرو کی دہائی دے کر، مردانگی اور غیرت کو بیدار کر کے مادرِ وطن کی حفاظت پر آمادہ کرتی ہے، للکار کر جگاتی ہے۔ ہمیں جنگ و جدل کے لئے، انقلاب کے لئے، بغاوت کے لئے اُکساتی اور

تیار کرتی ہے، ہمیں قربانی دے کر، جدوجہد کر کے زندگی کو حسین بنانے میں، کامیاب بنانے میں مدد دیتی ہے۔ عورت تعمیری کاموں میں مرد کی بہترین ساتھی ہے، رنج و غم کی ساتھی ہے بیماری میں عورت کے نازک ہاتھوں سے زیادہ اور کوئی راحت نہیں بخش سکتا۔ وہ سکھ چین کی بھی ساتھی ہے۔ تاریخ عالم کے صفحات گواہ ہیں کہ سیکڑوں عورتوں نے زندگی کے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں حتیٰ کہ وطن پر مرمٹنے، میدان جنگ میں بہادری کے پرچم گاڑ دینے میں بھی وہ پیچھے نہیں رہی ہیں۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ تعمیر سماج میں عورت نے ہمیشہ نہایت اہم حصہ لیا ہے اور آج بھی وہ پیچھے نہیں ہیں۔

ہمارا عظیم شاعر اقبال، مفکر شاعر اقبال، بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر اقبال ـــــ عورت کو کس رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ کیا وہ عورت کو زندگی کے ہر میدان میں مردوں کے ہم قدم آگے بڑھتے ہوئے دیکھنے کے خواہاں تھے؟ کیا وہ عورت کو مرد کے برابر سمجھتے تھے؟ کیا وہ چاہتے تھے کہ ہماری عورتیں جنگ آزادی میں، سیاست کے میدان میں

کھل کر حصّہ لیں؟ کیا وہ چاہتے تھے کہ ہمارے یہاں سیکڑوں اہلیہ بائی، چاند بی بی سلطانہ، رضیہ سلطانہ، تارا بائی، لکشمی بائی، بیگم حضرت محل، ماتنگنی ہاجرا، سروجنی نائیڈو جیسی عورتیں ہوں، جو میدانِ عمل میں کمر باندھ کر نکلنے کی ہمت رکھتی ہوں۔ صدیوں سے مذہب اور اخلاق کے نام پر عورتوں پر جو جو مظالم ڈھائے گئے، اُن کے تمام حقوق کو جس بے دردی سے کچلا گیا، معاشرے میں اُن کی اہمیت کو جس ڈھنگ سے ظالمانہ طور پر پامال کیا گیا، کیا اقبالؔ نے اُن مظالم کے خلاف پُرزور آواز بلند کی ہے؟ کیا اقبالؔ چاہتے تھے کہ عورتیں جدید اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور انجینئر، ڈاکٹر، سائنس داں، عالم و مفکر بن کر اپنا حصّہ ادا کریں۔؟

افسوس کہ فکرِ اقبالؔ میں ہمیں اِن باتوں کی کمی نہایت بُری طرح کھٹکتی ہے۔ شدّت سے اِس کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب فکرِ اقبالؔ کے اِس رُخ کا مقابلہ ہمیں کسی اور زبان کے اہلِ علم سے کرنا پڑے تو ہمیں شرمندگی کا احساس ہوتا ہے کہ ہمارے اتنے بڑے، بلکہ سب سے بڑے شاعر نے اِس طرف ضروری توجہ نہیں دی ہے

یا اُن کا اِس سلسلے میں نقطۂ نظر وسیع نہیں رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "اسمتھ اور بعض دوسرے مفکروں نے اقبالؔ کو عورت کے تعلق سے بہت رجعت پسند اور تنگ نظر بنایا ہے۔"[1]

عورت کے سلسلے میں اقبالؔ کے خیالات کا اگر ہم سرت چندر ٹیگور یا نذر الاسلام کے خیالات سے مقابلہ کریں تو بیسویں صدی کا ہمارا یہ عظیم شاعر سولہویں یا سترہویں صدی کے تنگ نظر شاعروں سے کسی طور پر آگے نظر نہیں آئے گا۔ نذر الاسلام کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر محمد عبد اللہ مصنف "نذر الاسلام" رقمطراز ہیں ۔

"اُن کو معلوم تھا کہ قوم کا نصف مرد ہے اور نصف عورت، انھوں نے ایک انسان کی حیثیت سے نیز معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے مرد اور عورت کے برابر حقوق تسلیم کر لیے۔ حرم میں پابند

۱۔ ڈاکٹر سیدہ جعفری۔ اقبالؔ نمبر ماہنامہ "محفل" لاہور ۱۹۷۷ء

عورتوں پر سے معاشرے کی بیجا پابندیوں
کو ہٹانے کی ہر ممکن کوشش کی، نادان
سماج نے عورتوں کے ساتھ جو ناانصافیاں
روا رکھی تھیں، اُس کے خلاف شاعر نے
آواز بلند کی۔ انھوں نے اس حقیقت
کو کھلم کھلا بیان کیا کہ عورت مرد کی
نفسیاتی خواہشات کی تسکین کا یا محض
اولاد پیدا کرنے کا آلہ نہیں بلکہ اس سے بلند
تر مقصد کے پیش نظر یہ جنس فطرت کی
آغوش میں جنم لیتی ہے...... جنھے دنیاو
مذہبی اور اخلاقی اصولوں کی دُہائی دے
کر جہاں مرد نے عورت کی زندگی دوبھر
کر رکھی تھی وہیں شاعر نے ڈنکے کی چوٹ
معاشرہ کو اس کی آزادی اور مساوات
کا پیغام سنایا..... عورت کو جنسی پیش
اس میں بھی فطرت نے بے انتہا صلاحیتیں
ودیعت کر رکھی ہیں..... شاعر نے
اس خوابیدہ جنس کو بیدار کیا اور اسے

اپنا حق طلب کرنے پر اکسایا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

نذرالاسلام نے صرف نام نہاد مہذب
اور معصوم عورتوں کے حق خود ارادیت
کی حمایت نہیں کی بلکہ غیر معصوم اور ادنیٰ
درجے کی عورتوں سے بھی انتہائی ہمدردی
کا اظہار کیا اور اُنھیں قعرِ مذلت سے
نکال کر شاہراہِ عظمت و وقار پر لاکھڑا
کیا۔ اُن کے خیال میں سماج کی بدترین
عورت میں بھی دلی حسن اور انسانی عظمت
موجود ہے۔ معاشرتی اصول کے مطابق
کوئی عورت کمینہ سے کمینہ کیوں نہ ہو
آخر وہ بھی معصوم محبت کی بدولت
شرافت کی مستحق بن سکتی ہے "۔ اقبال اور
نذرل کا مقابلہ کرتے ہوئے پروفیسر محمد عبداللہ لکھتے
ہیں " اقبال کا خیال ہے کہ بے منت مرد عورت کے
جوہر کی نمود نہیں ہو سکتی۔ مگر عورت کے بغیر بھی مرد کا جوہر
عیاں ہوسکتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں :۔

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر

غیرت کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کا نمود

مگر نذر الاسلام کا خیال ہے کہ عورت سے بھی مرد کا جوہر عیاں ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

آج شادی کے رنگ میں سب رنگے ہوئے ہیں
دل بھی رنگین ہے، زیورات بھی رنگین ہیں
اے عورت کہہ دے ——" آج اس رنگ ریلیوں میں
میری ہی بیداری ہے
تیرا رجحان گناہ کی طرف نہ ہو
اپنے شوہر کی خیر خواہی کی طرف ہو
شوہر کی رہنمائی کر دہ ——"

یا پھر نذر الاسلام "طوائف" سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:-

تجھے طوائف کہہ کر کون حقارت سے ٹھکراتا ہے؟
ممکن ہے تو سیتا جیسی کسی ستی کی بیٹی ہو
تو جو بھی ہو
ہماری ماؤں، بہنوں کی ہم جنس ہے

اور تیرے بچے بھی ہم جیسے ہی ہیں۔

(طوائف)

"

اور مساوات کے گیت گاتے ہیں ا۔

میری نگاہ میں مرد عورت سب برابر ہیں
دنیا کی حشمت اور جلال کی تعمیر میں
عورت کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا مرد کا

(عورت)

خیر ـــــ نذرالاسلام تو شاعر بغاوت ہی تھے انھوں نے کھل کر اُس مرد اور اُس کے سماج کو گالیاں دی ہیں جس مرد کے سماج نے عورت کو اپنی عزت و آبرو تک نیلام کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اسلئے نذر الاسلام کی بات جانے دیجئے۔ بہتر ہوگا اگر رابندر ناتھ ٹیگور کے چند خیالات پیش کردوں، چونکہ ہم اُن کو انقلابی یا باغی شاعر نہیں کہتے ہیں اور پھر ٹیگور عہد اقبال کے اہم ترین شاعر بھی ہیں۔ عورت سے متعلق ٹیگور کے چند خیالات حسب ذیل ہیں :۔

(۱) سماج کی آدھی آبادی کو حیوان بنائے رکھنا اگر

ایشور کی مرضی سے تشبیہہ دو، تو یہ اُس پاک نام کی بے عزتی کرنا ہے۔ عورتوں کو سماج سے دُور رکھ کر ہم سُکھ اور ترقی سے کتنے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس کا اندازہ ولایت کے سماج سے لگایا جا سکتا ہے۔

(خطوط سفرنامہ یورپ ۱۸۸۹ء)

(۲) جس ملک کے مرد محض نام کے مرد ہیں، وہی اور صرف وہی بے حیائی کے ساتھ مردوں کی پوجا (خدمت) کرنے کو عورت کا مذہب کہہ کر پرچار کرتے ہیں۔

(یورپ کی ڈائری۔ اکتوبر ۱۸۹۰ء)

(۳) میں (عورت) ایسی نہیں کہ
لاپرواہی سے مجھے پیچھے چھوڑ دو
اگر مجھے راہِ دشوار میں ہمراہ رکھو
اپنے تفکرات میں مجھے حصّہ دو
اگر اجازت دو ــــ کہ
میں تمہاری مشکلات میں مدد کروں
اگر مجھے دُکھ سُکھ کا ساتھی بناؤ
تب ہی ــــ

مجھے پہچان پاؤ گے

("چترانگدا" ۱۸۹۱ء)

(۴) کئی لوگ کہتے ہیں کہ تعلیم نسواں عام ہوئی ہے لیکن کیا وہ بھی کوئی تعلیم ہے؟ کیا وہ ایک انگریزی پرائمری لینے سے حتیٰ کہ انٹرنس پڑھ لینے سے دشوار راہوں کو پار کرنے کی طاقت حاصل کی جا سکتی ہے۔ سیکڑوں سالوں سے پشت در پشت چلی آنے والی فرسودہ روایات سے سر جھٹک کر کھڑا ہونا معمولی تعلیم اور صلاحیت کا کام نہیں ہے۔

(تنقید ۱۸۹۲ء)

(۵) انھوں نے کہا ــــــ بلا وجہ مردوں کا ایک سے زیادہ شادی کرنا خلاف تہذیب ہے۔ لیکن ہر حالت میں نہیں۔ جن کو خاندان کے نام کے لئے اولاد کی ضرورت ہے وہ کیوں دوسری شادی نہیں کریں گے۔؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب دوسری شادی کرنے جاؤ تو کوئی نہ کوئی وجہ تلاش کر لو یعنی دوسری شادی بلا وجہ نہ ہو ــــــ بکس

سوال یہ ہے کہ جس منطق کے ذریعہ یہ آزادی مردوں کو عطا کی گئی ہے بالکل اُسی منطق کے لحاظ سے عورت کو بھی آزادی دی جا سکے گی یا نہیں۔؟

(دنیا ادب ۱۸۹۴ء)

(۶) ہاں، اگر تم میں اور مجھ میں ہر کام اور ہر خیال میں یکسانیت ہوتی تو بہتر ہوتا۔ اگر تم میرے ساتھ ہر علم میں حصہ لے سکتیں تو خوش ہوتا۔ میں جو جاننا چاہتا ہوں وہ تمہیں بھی سمجھاتا۔ میں نے جو سیکھا ہے وہ تم بھی میرے ساتھ سیکھو۔ زندگی میں دونوں کا ایک ساتھ مل کر ہر میدان میں قدم اُٹھانے سے آگے بڑھنا سہل ہو جاتا ہے۔

(شریک حیات کے نام خط ۱۔ دسمبر ۱۹۰۰ء)

(۷) بہو رانی ابھی بچی ہے۔ سنسار اور اپنے معاملات میں اُس کا علم ابھی ادھورا ہے۔ لہذا اُس کے دل کو بیدار کرنے کی ذمہ داری تمہیں لینی ہوگی زندہ دلی کی تمام تر خوراک تمہیں فراہم کرنی ہوگی اُسکے اندر جو طاقتیں پوشیدہ ہیں اُن میں سے کوئی بھی تشنہ نہ جا سکے۔ یہ ذمہ داری تمہاری

ہے۔ تم اُسے بطور انسان دیکھو۔ یہ محض جنسی
خواہشات کے تحت یا گھر والی کے طور پر نہیں۔ اُس میں
جو قوتیں بھی پنہاں ہیں اگر اُن میں سے کوئی سہولت
نہ ملنے کی وجہ سے مرجھا جائے تو دیگر تمام صلاحیتوں
پر بھی اُس کا اثر پڑے گا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے
صرف اپنی پسند، اپنی خواہش اور ضرورت کے لحاظ
سے پرتیما کو نہ دیکھو۔ وہ اپنے طور پر کھلے اور پھول
بنے۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔

(خط بنام پرتیما دیوی، ستمبر ۱۹۱۰ء)

(۸) ایک طویل مدت تک انسانی تہذیب صرف مردوں
کے ہاتھ میں رہی ہے۔ اس تہذیب کو، سیاست
معیشت کو، سماجی اصولوں کو مردوں نے بنایا ہے
عورتیں پس پردہ گھر کے کونے میں پڑی رہیں۔ وہ
منظرِ عام پر نہ آسکیں۔ وہ تہذیب ایک طرفہ تھی۔
اس انسانی تہذیب کا ایک رخ بے سرمایہ تھا۔
وہ سرمایہ جو عورتوں کے دل کے خزانے میں دفن
تھا۔ آج اس خزانے کا دروازہ کھلا ہے۔ گھر کی دوشیزہ
آج کی دنیا کی دوشیزہ بن کر منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ (زبانی ستمبر ۱۹۳۶ء)

میں نے ٹیگور کی تخلیقات سے صرف آٹھ مثالیں لی ہیں چونکہ مثالیں زیادہ دے کر مضمون کو طویل کرنا درست نہیں ہے۔ یہ چند اقتباسات کتنے حقیقت پسندانہ، روشن خیال" اور ترقی پسند ہیں پر روشنی ڈالنا ضروری نہیں۔ مذکورہ مثالوں میں ٹیگور نے جو باتیں کہی ہیں اُن میں سے کسی کا مقابلہ عورت کے سلسلے میں اقبال کے خیالات سے کیا جا سکتا ہے؟ کیا کہیں بھی اقبال نے ایسے خیالات یا اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا ہے۔؟

ذاتی زندگی سے بحث کو بعض لوگ بُرا سمجھتے ہیں۔ اُن کا نعرہ ہے فنکار کو چھوڑیئے صرف فن پر کہئے۔ لیکن نقاد کے لیئے فنکار کی ذاتی زندگی کسی لحاظ سے کم اہم نہیں کیونکہ شاعر ہو یا ادیب، اُن کی ذاتی زندگی صرف اُن کی "اپنی" ہی نہیں ہوتی۔ ذاتیات سے تخلیقات کا گہرا تعلق ہوتا ہے، چولی دامن کا تعلق ہوتا ہے چونکہ تخلیق کرنے والا اپنے آپ کو خود سے دور نہیں رکھ سکتا۔ انسان وہ کرتا ہے جو وہ سوچتا ہے۔ یعنی فکر اور عمل کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ اِسکے علاوہ ہمیں یہ بھولنا چاہیئے کہ انسان میں کچھ نہ کچھ انسانی کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔

اور کہا جاتا ہے کہ اقبال ذاتی زندگی میں عشق کے معاملے میں کامیاب نہیں ہوئے جس کا اثر بھی اُن کی شاعری پر ہوا ہے ــــــــ بہر حال اقبال کی ذاتی زندگی کے سلسلے میں صرف ایک ہلکا سا خاکہ سامنے رکھنا ضروری ہے تاکہ معلوم ہو کہ اقبال کی ذاتی زندگی میں عورت کو کیا مقام حاصل رہا ہے اُن کی تین شادیوں اور خاص کر دوسری شادی اور بیوی سے بدگمانی کا علم ہر اُس شخص کو ہے جس نے حیات اقبال کا مطالعہ کیا ہے۔ دوسری شادی انگلستان سے واپسی کے بعد ہوئی تھی لیکن نکاح اور اسکے بعد رخصتی کے وقفہ میں چند گمنام خطوط سے اقبال کے دل میں شکوک پیدا ہو گئے کہ اُن کی یہ بیگم پاک دامن نہیں ہے اور بعد میں جب یہ انکشاف ہوا کہ وہ پاک دامن ہے تب علامہ نے اُسی خاتون سے دوبارہ نکاح کیا۔ جس شادی سے مسرت اُٹھا کر انھوں نے لکھا ــــــ "اب میں بالکل مطمئن ہوں اور اپنے آپ کو جنت الفردوس میں خیال کرتا ہوں ــــ" اس معمولی واقعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عورت کی پاک دامنی کے سلسلے میں اقبال نہایت شکی مزاج تھے ورنہ چند گمنام خطوط سے اقبال جیسے باشعور مفکر کو اتنا پریشان ہونے اور بیوی سے کنارہ کشی کر لینے کی ضرورت

نہیں ہوتی۔

عورت کی پاک دامنی پر حد سے زیادہ شک و شبہ کرنے کی ایک اہم وجہ غالباً یہی ہے کہ اقبال عہدِ شباب میں رنگ رلیوں سے دُور نہیں رہے۔ حالانکہ اُن کے عہدِ شباب کی رنگینیوں کا بھرپور ذکر کہیں نہیں ملتا لیکن جو کچھ بھی عہدِ اقبال میں اُن کے جاننے والوں نے اِس سلسلے میں ہلکے اِشارے کیئے ہیں وہ اِس نقطہ کو واضح کر دیتے ہیں کہ انھوں نے شباب کا لطف اُٹھایا ہے اور اُن کے قدم بھی جوانی میں، ڈگمگائے ہیں۔

عطیہ بیگم ہی وہ خاتون ہے جو یورپ میں اقبال کی رنگین محفلوں میں شرکت کے سلسلے میں کچھ بتا سکتی تھیں۔ اُس نے بھی تفصیل سے اقبال کے سلسلے میں کچھ نہیں لکھا۔ صرف چند تعریفات کا ہلکا خاکہ اُن کے بعض خطوط میں پایا جاتا ہے۔ یورپ کی رنگین محفلوں میں بھی اقبال نے شعر کہے ہیں۔ لیکن وہ اشعار کہیں شائع نہیں ہوئے اور نہ ہی محفوظ ہیں۔ اس لیئے اُن کی "رنگین شاعری" کا ہمیں تقریباً کوئی علم نہیں ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال نے یورپ کی پُر لطف محفلوں سے

متاثر ہو کر کیسے کیسے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ عطیہ بیگم کے حوالے سے ایک رنگین مجلس کا ذکر کرتے ہوئے عبدالمجید سالک لکھتے ہیں ــــ "یہ مجلس بے حد پُررونق اور درخشاں تھی۔ اِدھر اقبال فی البدیہہ اشعار سنا رہے تھے۔ اُدھر وہ لڑکیاں جھک رہی تھیں میں نے ارادہ کیا کہ اقبال کے اشعار لکھ لوں۔ اِس پر اقبال نے کہا کہ اِس قسم کے اشعار صرف وقتی اور ہنگامی ہوتے ہیں۔ بس پڑھے گئے اور قصہ ختم ہوا۔ اُن کو نقل کرنا بیکار ہے"۔[1]

۲۴ جون ۱۹۰۷ء کی ایک اور رنگین محفل کا ذکر بھی ہے جس محفل میں ڈاکٹر انصاری نے گانا سنایا۔ لارڈ سنہا کی لڑکیوں یعنی کوملا اور رمولا نے موسیقی میں اپنا کمال دکھایا اور اقبال نے تمام شب کا مجلس کے متعلق ایسے فی البدیہہ اشعار پڑھے کہ سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ گئے ــــ افسوس کہ تصانیف اقبال ایسے اشعار سے خالی ہیں۔

علامہ اقبال کا طوائف کے ہاں گانا سُننے کے متعلق ایک دو شہادتیں ضرور ملتی ہیں[2]۔ لیکن علامہ جس سماج سے تھے،

---

[1] ذکر اقبال ــــ عبدالمجید سالک

[2] دوشیزہ اردو ڈائجسٹ اقبال صدی ایڈیشن

اُس سماج میں طوائف کے کوٹھے پر جانا ایک بڑا پن ہی کمجھا جاتا تھا۔ اقبال کے کردار پر تنقید کرتے ہوئے ایک جگہ عطاءاللہ شاہ بخاری نے لکھا ہے کہ ـــــ "اقبال کا قلم تمام عمر صحیح رہا اور قدم اکثر و بیشتر غلط"۔ اقبال کے عہد شباب کا ذکر کرتے ہوئے سالک صاحب نے مزید لکھا "رنگ رلیوں کا ذکر آگیا تو یہ بھی سُن لیجیے کہ اقبال عنفوان شباب میں اپنے عہد کے دوسرے نوجوانوں سے مختلف نہ تھے۔ بلاشبہ وہ مصری کی مکھی ہی رہے شہد کی مکھی نہ بنے"۔ اقبال نے خود بھی کہا ہے کہ وہ "کردار کے غازی" نہ تھے۔ آل احمد سرور بھی لکھتے ہیں ـــ "بہت سی باتوں میں وہ گفتار کے غازی تھے اور کردار کے غازی نہ تھے۔ گفتار میں بھی سب پہلوؤں پر اُن کی نظر نہ ہوتی تھی"۔[۱]

یوں تو پورے کلامِ اقبال میں عورت کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اقبال کا "انسانِ کامل" ہو یا "مردِ مومن" یا اُن کا مشہور فلسفۂ خودی۔ اِن سب کا تعلق درحقیقت صرف

---

[۱] اقبال اور اُن کے نکتہ چیں۔ از آل احمد سرور،

مرد کی ذات سے ہے۔ چونکہ فکر، اقبال کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اِسی لئے "بانگِ درا" کو اُن کی نمائندہ تصنیف قرار نہیں دیا جاتا۔ "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" میں فکرِ اقبال کی چاشنی ہے اور اُن میں اُن کا طرۂ امتیاز "بالِ جبریل" ہی ہے چونکہ یہیں اقبال کا فکر جواں ہے۔ لیکن ان دونوں تصانیف یعنی "بانگِ درا" اور "بالِ جبریل" میں ہم عورت کے سلسلے میں فکرِ اقبال کو نہیں پاتے ہیں۔ عورت کے سلسلے میں اُن کے بیشتر اشعار صرف "ضربِ کلیم" میں ہیں۔ جس کو فکرِ اقبال کی پہلی منزل قرار دیا جاتا ہے۔ بہرحال کلامِ اقبال کے مطالعہ سے اتنا صاف ظاہر ہے کہ عورت سے اُن کو "ہمدردی" رہی ہے لیکن یہ ہمدردی محض دکھاوا ہے اور کچھ نہیں۔ اُن کی یہ ہمدردی اسی طرح کی ہے جس طرح ایک مظلوم و مجبور سے اظہارِ ہمدردی کے طور پر کیا جائے "افسوس ہے" ــــ اور بس

میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اِس عقدۂ مشکل کی کشود

یعنی ظلم کے خلاف کوئی آواز نہیں، احتجاج نہیں، جد و جہد نہیں!

حرکت نہیں، بغاوت نہیں ــــ مردِ مومن، انسانِ کامل، خودی کو بلند کرنے والا ــــ "مظلومیٔ نسواں" کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ مظلوم عورت جس "عقدۂ مشکل" میں ہے اُس عقدہ، اس گرہ، اس گانٹھ، اُس آفت کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اُس بکھیڑے میں وہ پڑ نہیں سکتا۔ اُسے محض "ہمدردی" ہے۔

یہ نہیں کہ اقبال کی زندگی میں اُن کو کسی ایسی عورت سے سابقہ نہیں پڑا جس کے حُسنِ اخلاق، بلند کردار اور علم و فہم سے وہ متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ عورت ماں بھی ہے اور اقبال کی عظیم نظموں میں سے کم از کم ایک کا تعلق "عورت ذات" سے ہے اور یہاں وہ عورت اقبال کی ماں ہے۔ یعنی وہ نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" ہے۔ ماں سے بھلا کیسے محبت نہیں ہوتی ــ؟ اور اگر وہ ماں ایسے وقت اس جہانِ فانی سے کوچ کر جائے جب بیٹا اُس سے کوسوں دُور ہو تو بیٹے کے دِل پر کیا گزرے گی کہ آخری وقت میں وہ اپنی پیاری ماں کو دیکھ بھی نہ پایا۔ اقبالؔ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ والدہ کے انتقال کے وقت اقبالؔ

وطن سے دور تھے۔ سید وقار عظیم نے اس پُراثر نظم کے سلسلے میں بجا فرمایا ہے کہ ــــــ "اردو میں اقبال کی شاید واحد نظم ہے جس میں وہ پڑھنے والے کو فکر اور جذبہ دونوں کے وام میں اسیر نظر آتے ہیں ــــ" اقبال کی دیگر کئی نظموں کی طرح اس مشہور نظم پر بھی انگریزی شاعر ولیم کوپر کی اُس نظم کا گہرا نقش ہے جسے ولیم کوپر نے اپنی والدہ کی ایک تصویر دیکھ کر کہی تھی ــــ "ولیم کوپر چھ برس کا تھا جب اُس کی ماں کا انتقال ہوا۔ برسوں بعد اُس کے بڑھاپے کے دنوں میں جب ایک عزیزہ نے اُس کی ماں کی تصویر اُسے بھیجی تو اُس نے ماں کی یاد میں یہ زندہ جاوید نظم لکھی تھی" [۱]

ایک وقت تھا جب تعداد ازدواج کے سلسلے میں اقبال کا خیال تھا کہ ــــ "تعداد ازدواج کا دستور بھی اصلاح طلب ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کا جائز قرار دیا جانا ایک دقیق روحانی وجہ پر مبنی تھا اور علاوہ اسکے ابتدائے اسلام میں اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے اس کی ضرورت بھی تھی مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں، موجودہ مسلمانوں کو فی الحال

---

[۱] مضمون "علامہ اقبال اور انگریزی شعراء" از ساجد طفیل

اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ موجودہ حالت میں اس پر زور دینا قوم کے اقتصادی حالات سے غافل رہنا ہے اور امرائے قوم کے ہاتھ میں زنا کا ایک شرعی بہانہ دینا ہے۔[1]

ٹیگور کے جو اقتباسات دیئے گئے ہیں اُن میں سے ایک یعنی ۱۸۹۴ء میں ہم دیکھتے ہیں کہ ٹیگور نے نہایت سختی سے مردوں کی ایک سے زیادہ شادی کی مخالفت کی ہے۔ اقبال بھی اسی خیال کے حامی تھے اور اقبال کے یہ خیالات ۱۹۰۴ء یعنی سفر یورپ سے قبل کے ہیں۔ لیکن اقبال کے فلسفے اور عمل میں کافی فرق ہے اقبال نے اگر ایک سے زیادہ شادی کو "امرائے قوم کے ہاتھ زنا کا ایک شرعی بہانہ" قرار دیا ہے تو خود انھوں نے ہی تین شادیاں کی ہیں حالانکہ دوسری شادی کے بعد وہ اپنے آپ کو "جنت الفردوس" میں پاتے رہے ہیں لیکن پھر بھی اُن کو ایک اور شادی کرنے کی "ضرورت" پیش آئی ہے۔ اقبال کے بعض خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ اگر وہ لائق ہوتے تو اور بھی شادیاں کرتے۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے نام ایک خط

---

[1] قومی زندگی — از اقبال،

میں لکھتے ہیں ؎ "ایک معصومہ پنجاب میں رہتی ہے۔ میں نے کبھی اُسے دیکھا نہیں مگر سنا جاتا ہے کہ حُسن میں لاجواب ہے...... چند روز ہوئے اُس کا خط مجھے موصول ہوا کہ مجھ سے نکاح کر لو ......، دل تو یہی چاہتا تھا کہ اِس کارِ خیر میں حِصّہ لوں مگر کمر میں طاقت ہی نہ رہی۔ کافی نہیں۔ اس کے لیے دیگر وسائل بھی ضروری ہیں، مجبوراً مہذبانہ اِنکار کرنا پڑا۔"

ماں اور بیوی کے علاوہ دیگر چند خواتین سے بھی اقبالؔ متاثر ہوئے ہیں۔ جن میں اُن کی دو اُستانیاں شامل ہیں۔ عبد المجید سالک ان استانیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ــــ "جرمنی میں دو جوان اور حسین پروفیسر عورتیں فراؤ پروفیسر واڑناسٹ (Wenegast) اور فراؤ پروفیسر سینے شال (Senechal) اقبالؔ کی استانیاں تھیں جو انھیں فلسفے کے مختلف پہلوؤں کی تعلیم دیتی تھیں ...... دن بھر کی رسمی تعلیم کے خاتمے پر طلبہ اور پروفیسر پاس ہی ایک دریا کے کنارے کافی ہاؤس میں جا بیٹھتے اور وہاں دونوں خاتون پروفیسر، جرمن، یونانی

؎ سہ ماہی اردو کراچی اپریل ۱۹۶۷ء

اور فرانسیسی فلسفے پر مذاکرہ شروع کر دیتیں۔ اقبال اُن کے علم و فضل سے بے حد متاثر ہوتے اور ایک ایک لفظ کو بہ غور سنتے خصوصاً وہ فراؤ سینے شال کی معلوماتِ علمی سے بہت مرعوب تھے[1]" اِن ہی پروفیسروں کا ذکر کرتے ہوئے جمیل ملک نے لکھا ہے[2] "اقبال کی جرمن اساتذات تھیں مگر کسی کو معلوم تھا کہ اقبال رات دن انھیں اپنے تصورات کے آئینہ خانے میں سجا کر اُن کی پرستش کیا کرتا تھا۔ اقبال کو اِن نسوانی پیکروں میں وحشت و عظمت کا جو امتزاج ملا، صورت و سیرت کی جو دلکشی نظر آئی تشکیل و تکمیل کا جو جلال و جمال و کمال دیا وہ برسوں بانگ درا کی کئی نظموں میں مختلف و متنوع روپ اختیار کر کے ہماری نظروں کو خیرہ کرتا رہا۔ "کسی کی گود میں بلی دیکھ کر" "دریائے نیکر کے کنارے ایک شام" "عاشق ہرجائی" اور "پھول کا تحفہ عطا ہونے پر" کے انداز کی نظمیں اسی رعنائی و زیبائی کا پرتو ہیں۔ جس کا نقش اقبال کے ذہن پر اپنے زمانہ تعلیم میں ہی ثبت ہو چکا تھا۔ مگر اقبال کا یہ رومانی یہ خواب

۱۔ ذکرِ اقبال۔ عبدالمجید سالک

۲۔ سہ ماہی "خرام" چاٹگام شمارہ ۱۲

شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔" اقبال کے داستانِ عشق پر لکھتے ہوئے محمد عظیم فیروزآبادی نے لکھا ہے [1] "ادب کے مسائل اخلاقیات کے مسائل نہیں ہوتے۔ اخلاقی طور پر اکثر غیر ذمہ دار افراد بڑے اعلےٰ فنکار ہوتے ہیں اور خصوصاً ایک شاعر سے بلند کرداری کی توقع رکھنا احمقوں کی دنیا میں رہنا ہے اقبال ہماری آپ کی طرح ایک انسان تھے اور گوشت پوست کی ان تمام کمزوریوں کا شکار جو لازماً انسانیت ہیں۔ اور ہم سے دن رات سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ اس سے نہ علامہ کی توہین ہوتی ہے اور نہ اُن کی عظمت پر حرف آتا ہے۔"

اسی مضمون میں محمد عظیم صاحب نے لکھا کہ اقبال کے لیے "بیرسٹر جلال الدین کے یہاں رقص و نغمہ کی محفلوں میں شریک ہونا اس کا تقریباً روزانہ کا معمول تھا اور ہیرا منڈی سے اس کی دلچسپی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ...

...لاہور سے باہر جب مشاعروں اور کانفرنسوں میں اُسے مدعو کیا جاتا تھا تو کوشش کرتا تھا کہ اس کا یہ سفر ضائع نہ جائے۔ چنانچہ ایک بار جب وہ مسلم ایجوکیشنل

---

[1] ماہنامہ اردو ڈائجسٹ۔ اقبال صدی نمبر اگست ۱۹۷۷ء

کانفرنس میں شرکت کے لئے لکھنؤ آیا تو شام اودھ کی رنگینیوں کو اپنے دامن میں بھر لینے میں اُس نے تامل نہیں کیا" تعلیم اور سفر یورپ کا ذکر کرتے ہوئے موصوف نے لکھا ہے "۱۹۰۵ء میں جب وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلینڈ اور جرمنی گیا تو وہ اپنی متاہلانہ زندگی سے ناآسودہ تھا...... وہ سمجھتا تھا والد محترم نے اس کی مرضی کے خلاف شادی کر کے اُس کی زندگی کو دردناک عذاب میں مبتلا کر دیا ہے اور ایک انسان کی حیثیت سے اُسے بھی مسرت حاصل کرنے کا حق ہے...... ان حالات میں انگلینڈ یا جرمنی میں جب ان حسین دوشیزاؤں کے ساتھ اس کی شب و روز کی صحبت رہی جو Old Taboo (حرام حلال کے فرسودہ توہمات) کی خاطر جسمانی لذتوں سے کنارہ کش ہونا حماقت سمجھتی ہیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اُس نے افلاطون کا شاگرد بنے رہنے پر قناعت کی ہوگی عطیہ یا عطیہ کے قسم کی آزاد خیال عورتوں سے اس کا شادی نہ کرنا خود اس بات کا غماز ہے کہ وہ اُن سے آسودہ ہو چکا تھا۔"

اقبال نہیں چاہتے تھے کہ عورت زندگی کے ہر میدان

میں باعمل رہے، مرد کا ساتھ دے، ہاتھ بٹائے، مرد کی برابری کرے کیونکہ وہ عورت کو مرد سے کمتر سمجھتے تھے۔ وہ عورت کو نہایت کمزور بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اتنا کمزور کہ وہ نہ خود اپنے پیروں پر کھڑی رہ سکتی ہے اور نہ خود آگے قدم بڑھا سکتی ہے۔ یا پھر اگر وہ گھر کے دامن سے قدم بڑھا کر آگے نکل آئے، یا اُسے آگے بڑھایا جائے، تو وہ سماج کے لئے خطرہ بن جائے گی۔ اِن وجوہات کی بنا پر اقبال، آزادیٔ نسواں کے سخت مخالف رہے ہیں۔

ایک وہ دور تھا جب اقبال عورتوں کی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں انھوں نے لکھا ——— "پس ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ تمدن کی جڑ (عورت) کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم کی عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔ مرد کی تعلیم صرف ایک فردِ واحد کی تعلیم ہے مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ اگر اس قوم کا آدھا حصہ جاہل مطلق رہ جائے"[1]

---

[1] قومی زندگی ——— از اقبال،

اقبالؔ کے یہ الفاظ روشنی کے مینار معلوم ہوتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ وہ عورتوں کو کتنی اور کیسی تعلیم دینے کے حق میں رہے ہیں ـــــ وہ لکھتے ہیں ـــــ "لیکن اس ضمن میں ایک غور طلب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مشرقی عورتوں کو مغربی طریق کے مطابق تعلیم دی جائے یا کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے اُن کے وہ شریفانہ اطوار جو مشرقی دل و دماغ کے ساتھ خاص ہیں قائم رہیں۔ میں نے اِس سوال پر غور و فکر کیا ہے مگر چونکہ اب تک ملک کسی قابلِ عمل نتیجے پر نہیں پہونچا اِس واسطے فی الحال میں اِس بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔"[1]

یہ ہے ۱۹۰۴ء کی بات۔ تب تک اقبالؔ یہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ اگر عورتوں کو تعلیم دی بھی جائے تو وہ تعلیم کیسی ہو۔؟ یا کہاں تک تعلیم دی جائے ـــــ؟ لیکن اِس سلسلے میں اپنی رائے کو آخری شکل دینے میں انھوں نے طویل عرصہ برباد نہیں کیا۔ ۱۹۱۶ء تک وہ یہ فیصلہ کر پائے کہ ـــــ "قومی

---

[1] قومی زندگی ـــــ از اقبالؔ ۱۱

ہستی کی مسلسل بقاء کے لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتداءً (یہاں مضمون سے صاف ہے کہ قوم سے اقبالؔ صرف مسلمانوں کی بات کرتے ہیں) ٹھیٹھ مذہبی تعلیم دیں۔ جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں تو اُن کو اسلامی تاریخ، علم تدبیر خانہ داری اور علم اصولِ حفظِ صحت پڑھایا جائے ¹ اور بس!

اقبالؔ کے خیال میں عورتوں کو اِس سے آگے پڑھانے، یا پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی جدید اعلیٰ تعلیم اور جدید علوم سے آگاہی عورت ذات کے لئے بقول اقبال نہ صرف نہایت ہی غیر ضروری ہے بلکہ خطرناک ہے، سماج کے لئے خطرہ ہے۔ کیا خطرہ ہے؟ اُس سے بھی اقبالؔ آگاہ کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اِس سے عورت مرد کے مقابلے پر اُتر آئیں گی۔ لہٰذا عورتوں کو نہ سائنس کی تعلیم دی جائے نہ تاریخ یا جغرافیہ کی، نہ معاشیات یا اقتصادیات کی، نہ صحافت کی اور نہ سیاستِ عالم کی ـــــ چونکہ

---

¹ ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر ـــــ اقبالؔ،

آخر عورتوں کو جدید علوم کی تعلیم دینے سے حاصل ـــ ؟
جب کہ بقول اقبالؔ اُن کو گھر کی چہار دیواری ہی میں
رہنا چاہیئے ۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبالؔ کو فلسفہ کی تعلیم دینے والوں
میں دو خواتین پروفیسر بھی رہی ہیں ۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں
کہ اقبالؔ نے تاریخِ عالم کا مطالعہ کیا ہے ۔ لہٰذا انھوں
نے اُن نامور عورتوں کی زندگی اور اُن کی خدمات و
قربانیوں کا مطالعہ ضرور کیا ، جن عورتوں نے تن من دھن
کی بازی لگا کر ملک و قوم اور پوری انسانیت کی بقا و ترقی
کے لئے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ۔ اسکے باوجود
اقبالؔ یہی چاہتے تھے کہ عورتیں گھر میں رہیں ، شوہر کی
خدمت کریں اور خانہ داری کے فرائض انجام دیں ۔ اِس
سے آگے نہ بڑھیں ۔

عورتوں کے سلسلے میں اقبالؔ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں
وہ فرماتے ہیں :۔

” مجھے عورتوں پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں ہے ۔ یہ اپنے

مشاغلِ مخصوص مثلاً خانہ داری میں بھی بلند ذہنیت کا ثبوت نہیں دیتی"[۱] ہائے رے عورت — باہر کی دنیا کے دروازوں کو تو اقبال نے بند ہی کر دیا تھا۔ اب وہ انھیں گھر سنبھالنے کے لائق بھی نہیں سمجھتے رہے۔ چونکہ بقول اقبال — "عورت کو دماغ کمزور ملا"[۱] ہے۔

آزادیِ نسواں کے سلسلے میں اقبال لکھتے ہیں :-

"عورتوں کو آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے اُلٹا نقصان رساں ثابت ہوگا اور نظامِ معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں واقع ہو جائیں گی" — "کھلے کھلے لفظوں میں اس امر کا اعتراف میں ضرور کروں گا کہ میں مرد اور عورت کی مساوات مطلق کا حامی نہیں ہو سکتا"[۱]

یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اقبال، اقبال بنے، لیکن اُسی تعلیم کو اقبال نے عورتوں کے لئے خطرناک قرار دیا

---

[۱] ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر — از اقبال،

وہ کہتے ہیں :-

"عورتوں میں اعلیٰ تعلیم سے بھی جس حد تک کہ افرادِ قوم کی شرحِ ولادت کو تعلق ہے، جو نتائج مرتب ہوں گے وہ بھی غالباً پسندیدہ نہ ہوں گے ــــــ"

ــــــ اور چونکہ یورپ کے سماج نے عورتوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی جو چھوٹ دے رکھی ہے اِس لئے "اقبال" کے خیال میں "فرنگی مرد" تنگ "سادہ فراج" ہے اور وہ "بیچارہ" ہے جس "بے چارہ" کا قصور یہ ہے کہ اُس نے عورتوں کو آزادی دی، آگے بڑھنے دیا اور اسلئے اقبال "مردِ فرنگ" کو "زن شناس" تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ اسکے بالکل برعکس ٹیگور نے لکھا:-

"عورتوں کو سماج سے دور رکھ کر ہم سکھ اور ترقی سے کتنے پیچھے رہ گئے اس کا اندازہ ولایت کے سماج سے لگایا جا سکتا ہے ...... سیکڑوں سالوں سے پشت در پشت چلی آنے والی فرسودہ روایات سے سر جھٹک کر (عورتوں سکھ لئے) کھڑا ہونا معمولی تعلیم اور صلاحیت کا کام نہیں ہے ــــــ" اور اقبال کا خیال ہے کہ محض عورتوں کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے ہی سے یورپ کی معاشرت میں "فساد" برپا ہوگیا ہے۔ یعنی بقول اقبال "فساد" کی جڑ عورتیں

کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہے، سرمایہ دارانہ نظام حکومت و معاشرت نہیں۔ اقبال کہتے ہیں :-

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

اقبال کے یہاں عورت ایک ایسا "رنگ" ہے جس سے "کائنات" میں رنگ بھرا جا سکتا ہے لیکن عورت سے اقبال کائنات میں کس طرح کا رنگ بھرنا چاہتے ہیں-؟ بالکل ویسا ہی رنگ جو صدیوں پرانا ہے۔ یعنی عورت کے سلسلے میں اقبال تاریخ کو صدیوں پیچھے دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ گزشتہ صدیوں میں سماج نے جن ارتقائی منزلوں کو طے کر لیا ہے، تاریخ نے جو طویل سفر کیا ہے اور اس سفر سے سماج میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اُن پر اقبال کا اثر کم از کم "عورت" کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے نہیں ہوتا اور اقبال کا خیال تعلیم نسواں کے سلسلے میں نہیں بدلتا۔ اقبال نے بھی اُن ہی خواہشات کا اظہار آج کے سماج میں کیا ہے، جو کٹر مُلّا اور بنیادیت، فرسودہ روایات کو گلے سے لگائے رکھنے والے لکیر کے فقیر، کیا کرتے ہیں چونکہ وہ لوگ بھی عورت کو مرد سے کمتر

جنس، مرد کا غلام اور گھر کی چہار دیواری میں اُسے قید رکھنے اور محض اپنی نفسیاتی خواہش کو مٹانے اور بچے پیدا کرنے کی مشین ہی سمجھا کرتے ہیں اور عورت کو اسی حالت میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اقبال کا فلسفہ ہے کہ عورت ضروری دینی تعلیم حاصل کرے، پاک دامن رہے اور شوہر کی خدمت بلکہ پرستش کرے —— یہ اس لئے کہ عورت سے "کائنات" میں "رنگ" بقول اقبال مرد ہی بھرے گا چونکہ عورت خود نہایت کمزور ہے۔ اُسے عقل کم ملی ہے —— اسلئے وہ رنگ مرد کی خواہش کے مطابق بھرا جائے گا۔ بھلا عورت کی خواہش کیا معنی ۔؟ عورت اپنی بھلائی کی فکر کیونکر کر سکتی ہے۔؟ بیسویں صدی کے اس عظیم مفکر شاعر نے عورتوں کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ وہ ترقی کے ہر میدان میں محض مرد کی فتوحات کا پرچم بلند لہراتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے —— اور بس!

اقبال نے نہ صرف جدید اور اعلیٰ تعلیم غیر ممالک میں پائی ہے بلکہ انھوں نے دنیا کے کئی ممالک کا سفر بھی کیا ہے۔ اور صرف اقبال ہی کیوں؟ آج بھی ہند و پاک میں

جتنے نامور ڈاکٹر، انجنیئر، سائنس داں، پروفیسر، سیاستداں
تاریخ داں، فلسفہ داں اور دیگر ماہرین مثلاً ماہرین اقتصادیات
معاشیات، ارضیات، فلکیات، طبیعات، ریاضیات، اثریات
اور جوہریت وغیرہ وغیرہ ہیں۔ اُن تمام نے مغربی طرز پر
تعلیم حاصل کی ہے۔ چاہے وہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے
سند یافتہ ہوں یا یورپ کے تعلیم گاہوں سے۔ لیکن تعلیم کا طرز
مغربی ہی ہے۔ اگر ان مردوں میں جدید اعلیٰ مغربی تعلیم
پانے کے باوجود، خرابی پیدا نہیں ہوئی ہے، اگر اُن کے علم سے
ملک و قوم کو فائدہ پہونچا ہے تو پھر وہی علم اگر خواتین حاصل
کرلیں تو سماج کو نقصان کیوں ہوگا۔؟ لیکن جدید
اعلیٰ تعلیم یافتہ اقبال، عورت کے لئے جدید تعلیم کو شجر ممنوعہ
قرار دیتے ہیں۔ چونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ اس سے عورت
بگڑ جائے گی۔ اُس کی پاک دامنی کو، اُس کی نزاکت
لطافت، اور نسوانیت کو دھکا لگے گا یا خطرہ ہے کہ وہ مردوں
کے مقابلہ میں سامنے آکھڑی ہو جائے گی لہٰذا وہ عورت
کو صرف کچھ دینی تعلیم وغیرہ دے کر "نیم حکیم" بنائے
رکھنے کے خواہاں ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی عورت جدید
علوم سے مالا مال ہو کر پروفیسر، ڈاکٹر، انجنیئر وغیرہ وغیرہ

نہ بن جائے چونکہ بقول اقبالؔ تعلیم نسواں سے کیا حاصل جب کہ عورت کو مرد کے زیرِ نگرانی ہی رہنا ہے۔ جب کہ مرد ہی اُس کا "نگہبان" ہے۔ اقبالؔ کا خیال ہے :-

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت

"جس علم" سے یہاں اقبالؔ نے "جدید تعلیم" کو لیا ہے اور اقبالؔ نے لفظ "تعلیم" کے بدلے "علم" کا استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ شعری ضرورت کے لئے ہو لیکن عموماً اقبالؔ شعری ضرورت کے لئے معنی کو قربان کرنے والے نہیں رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اقبالؔ نے اپنے اُستاد سخن مولانا شیخ عبدالقادر گرامی کے شعری مشوروں کو بھی بعض وقت قبول نہیں کیا۔ مثلاً اپنے استاد کی ایک ترمیم کے سلسلے میں لکھتے ہیں ـــــ "آپ کی ترمیم سے زبان کے اعتبار سے شعر بہت ستھرا ہو گیا ہے مگر افسوس کہ اِس سے وہ مطلب ظاہر نہیں ہوتا جو میں ادا کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا معانی کے اعتبار سے میں اپنے ہی مطلع کو ترجیح دیتا ہوں ـــ" اِسلئے یہ کہنا کہ اقبالؔ نے

محض شعری ضرورت کے مدِ نظر "تعلیم" کے بجائے "علم" لکھا مشکل رہے۔ ظاہر ہے "علم" روشنی کا نام ہے، لاعلمی یا اندھیرے کا نہیں۔ پھر لفظ "حبس" کا استعمال کر کے اقبال نے علم کو مخصوص اور قید کر دینا چاہا ہے۔ اور بحث و تکرار کے لئے راستہ ہموار کیا ہے کہ میرا مطلب یوں نہیں یوں ہے۔ لیکن اس "حبس" کے پردے میں بھی ارادہ صاف ہے کہ اقبال عورتوں کے لئے جدید اعلےٰ تعلیم کو ناپسند کرتے رہے ہیں اور یہ "ارباب نظر" وہی ہیں جن کو شاعری کی زبان میں ہم "ملا اور پنڈت" یا "شیخ و برہمن" کہتے ہیں یعنی وہ افراد جو فرسودہ خیالات کے نمائندے ہیں، ترقی کے خلاف ہیں اور جو آج بھی عورتوں کو گھر میں قید رکھنے کے طرفدار ہیں۔

جس شاعر کے خیالات عورت ذات کے سلسلے میں ایسے ہوں، وہ شاعر دیگر لحاظ سے کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو، اُس کی اہمیت دیگر میدانوں میں مسلّم ہی کیوں نہ ہو، عورتیں اُس کی دل سے عزت و احترام کیوں کر کر سکتی ہیں؟ اردو ادب میں کبھی خواتین نے اقبال کے خیالات کو فرسودہ

ہی قرار دیا چونکہ یہی وہ خیالات ہیں جو ان کی آزادی اور ترقی کی راہ میں صدیوں سے کانٹوں کی طرح بچھائے گئے ہیں جو باتیں کہہ کر، دلائل دے کر اُن کو اعلےٰ تعلیم سے ہمیشہ دُور رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تنقیدی مضامین ایک ایسی خاتون ہی لکھ سکتی ہے جس کا مطالعہ گہرا ہو اور جس نے جدید علوم کی تعلیم حاصل کی ہو۔ دیکھئے خواتین نے خود اقبالؔ کے سلسلے میں کیسے کیسے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ محترمہ ام۔ عمارہ صاحبہ نے اقبالؔ کے سلسلے میں لکھا ــــــــ "اقبالؔ بڑے وسیع النظر اور وسیع القلب سہی لیکن عورت کے باب میں وہ بھی لکیر کے فقیر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے بھی عورت کو شرافت و پاکبازی کا ایک مجموعہ قرار دیا ہے جس کی نہ خوبیاں ہی اُسکی اپنی ہیں اور نہ اُسکی کمزوریاں ہی اُس کی اپنی ہیں گویا وہ ایسی موم کی گڑیا ہے جس کے افعال اور کردار کی تمام تر اچھائیوں اور بُرائیوں کے ذمہ دار مرد ہیں۔ ان کے نزدیک عورت کا وجود ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حل بھی مردوں ہی کی عقل کا رہین منت ہے۔ گویا عورت معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں برابر کی شریک نہیں بلکہ محض مٹی کی مورت ہے ..... اقبالؔ بھی عورت کو خلوت کی زینت سمجھتے ہیں اور اُن کے خیال میں اس دَور کی رسوائی

خلوت کی ہوس کی بدولت ہوتی ہے جہاں نگاہیں تو روشن ہو جاتی ہیں لیکن دل کا آئینہ تکدر سے پاک نہیں نظر آتا۔ اُن کی وسیع النظری تو یہ ہے کہ عورت کو چاہیئے کہ وہ اپنے وجود کو محدود سے محدود تر کر دے۔ اور یہی نہیں انھوں نے عورت کے ذوقِ نظارہ کو بھی حدود کا پابند خیال کیا ہے۔ عورت اُن کے یہاں ایک آزاد اور زندہ روح کا نام نہیں بلکہ روایات اور اصولوں میں جکڑی ہوئی قیدی ہے" ع۱

محترمہ ڈاکٹر سیدہ جعفری لکھتی ہیں :-

" اقبال کے خیال میں عورت مرد سے کم تر ہے اور عورتوں اور مردوں کا دائرہ عمل بالکل مختلف ہے۔ وہ عورت کی پاکدامانی پر زور دیتے ہیں اور اسی پاکیزگی کو عورت کی زندگی کا نصب العین قرار دیتے ہیں ..... اگر مغرب کی عورت سیاست و معیشت میں مرد کی برابری کا دعویٰ کرتی ہے تو یہ اقبال کی نظر میں باطل ہے ..... وہ صنفِ نازک کو مرد کا رہینِ منت سمجھتے ہیں " ع۲

اقبال کی زندگی اور پھر اقبال کے بعد، اقبال پر بہت کچھ

ع۱ دیکھیے رسالہ "قومی زبان" انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، جون ۱۹۷۶ء

ع۲ دیکھیے اقبال نمبر رسالہ "نقوش" لاہور نومبر ۱۹۷۷ء

لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ غالب اور اقبال ہی وہ خوش نصیب اردو فنکار ہیں جن پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ کلام و فلسفۂ اقبال پر تنقید و تبصرہ کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ظاہر ہے کہ سب قلم کاروں نے تنقید برائے تنقید نہیں کی ہے۔ سیماب اکبرآبادی سے لے کر بابائے اردو مولوی عبدالحق اور پھر عصر جدید کے کئی نامور اہلِ قلم نے اقبال کے خیالات پر تنقیدی روشنی ڈالی ہے۔

عورت کے سلسلے میں خواتین کے خیالات سے اقتباسات کے بعد اب چند صاحبِ قلم حضرات کی رائے بھی اِس سلسلے میں دیکھیئے ـــــ بقول آل احمد سرور "ہندوستان میں جدید اسلام کے مؤلف ڈبلیو سی، اسمتھ نے "اقبال کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ اقبال کے بہت بڑے مداح ہیں" لیکن وہ بھی عورت کے سلسلے میں اقبال کو رجعت پرست کہتے ہیں۔ اُن کے مطابق "انسانیت کے لئے ان کا (اقبال کا) جو خاص پیغام ہے اُس میں عورتیں شریک نہیں ہو سکتیں۔ وہ آزادیِ نسواں کو نہ مرد کے گلوبند کے مقابلہ میں کمتر سمجھتے ہیں" [۱]

اور خود آل احمد سرور اِس سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

---

[۱] نئے اور پرانے چراغ ۔ آل احمد سُرور،

”۔ نظام معاشرہ میں سب سے اہم حیثیت عورت کی ہے تا اقبال آزادیِ نسواں کے خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک اُس کا یہی شرف کیا کم ہے کہ وہ افلاطون پیدا کر سکتی۔ اسے مکالمات لکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں اقبال عورت کے حق میں بڑی زیادتی کرتے ہیں۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ آزادیِ نسواں اور "زمرد کے گلوبند" میں کون سی چیز زیادہ قدر و قیمت رکھتی ہے۔ یوسف صاحب (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) کا خیال اِس سلسلے میں زیادہ صاف نہیں ہے۔ علم و فضل کے راستے عورت پر بند کرکے موجودہ جرمن نظریے کے مطابق اُسے باورچی خانے اور کلیسا اور گھر کی چار دیواری میں بند کرنا، اُس کے ساتھ ظلم ہے۔ دراصل اس مسئلہ میں اقبال کی خود کوئی رائے نہیں ہے۔ وہ اِس بحث کا خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکے ہیں۔ یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ بعض چیزوں میں اقبال خود اپنے ذہن کو زیادہ ہموار نہیں رکھ سکے ہیں ـــ ؎۱

جناب اختر انصاری صاحب اس سلسلے میں رقمطراز ہیں: یہ ۱۹؍ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے جسے اختر صاحب نے یوں قلمبند کیا ہے ؎۲

؎۱ روحِ اقبال - آل احمد سرور - ؎۲ ایک ادبی ڈائری - اختر انصاری طبع اول ۱۹۴۴ء ص ۴۲

—— "ایک نوجوان خاتون جو بی۔ اے کے امتحان کی تیاری کے سلسلے میں اقبالؔ کی چند نظمیں میری مدد سے مطالعہ کر رہی ہیں، اقبالؔ کے نظریوں کی تشریح کے دوران میں اچانک بولیں —" اقبالؔ کا پیغام مردوں ہی کے لئے ہے، عورتوں کے لئے نہیں ہے "؟ میں جب اس سوال کا جواب دینے سے قاصر رہا کیونکہ اقبالؔ کے فلسفے میں عورت کو واقعی کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اُن کے پیغام کا مخاطب اصلی مرد ہے۔ اثباتِ خودی، کشاکشِ پیہم اور ارتقائے نفس کے نظریئے انھوں نے مردوں ہی کے لئے وضع کئے ہیں۔ وہ انسانی زندگی میں عورت پر مرد کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ایک مرد، عورت کا محافظ ہے اور عورت مرد کی دست نگر۔

اقبالؔ مرحوم کے فلسفیانہ افکار میں جگہ جگہ شوپنہار اور نٹشے کے خیالات کی جھلک نظر آتی ہے۔ شوپنہار عورت کے بارے میں نہایت رجعت پسندانہ نظریہ رکھتا تھا۔ اُس کا عقیدہ یہ تھا کہ عورت محض افزائشِ نسل کا ذریعہ ہے۔ نٹشے کا بھی یہی عقیدہ تھا چنانچہ وہ صاف صاف کہتا ہے

کہ مرد کا کام یہ ہے کہ وہ سپاہی بن کر جنگ آزمائی کرے اور عورت کا فرض یہ ہے کہ وہ سپاہی کے لیے سرمایہ عیش و نشاط ہو۔ مغرب کے یہی دونوں مفکر فاشزم کے فلسفے کے بانی قرار دیئے جاتے ہیں اور آج فاشسٹ جرمنی میں جہاں اُن کے پیش کردہ نظریہ حیات کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے وہاں عورت کے بارے میں بھی اُنھیں خیالات کو مصدرِ ہدایت تصور کیا گیا ہے۔ اقبالؔ کے افکار اور اِن دونوں فلسفیوں کے خیالات میں جو مماثلت پائی جاتی ہے وہ یقیناً قابلِ افسوس ہے"

جناب جمیل ملک صاحب نے بھی اِس سلسلے میں ایک مضمون میں اپنے خیالات کا اِسی طرح اظہار کیا ہے ۔[1] فرماتے ہیں:۔

"نٹشے کی طرح اقبالؔ کا بھی یہی خیال تھا کہ اگرچہ مرد اور عورت دونوں کا کام تخلیق کرنا ہے۔ لیکن ان دونوں کے طریق تخلیق میں فرق یہ ہے کہ جہاں مرد دماغ سے تخلیقی کام لیتا ہے وہاں عورت پیٹ سے تخلیق کا کام لیتی ہے۔

---

[1] رسالہ "خرام" ڈھاکہ جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۳

اِس لئے عورت کا اول و آخر فریضہ یہی رہ جاتا ہے کہ وہ نئی سے نئی نسل کو جنم دیتی ہے اور پروان چڑھاتی ہے ...... اقبالؔ کے کلام سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ عورت فطری طور پر ایک کھلونا ہے اور کھلونوں سے کھیلنا ہی پسند کرتی ہے وہ طبعاً آزادی نہیں چاہتی۔ اور پھر ایسی تعلیم کے بھی خلاف ہیں جو عورتوں کو امورِ خانہ داری اور خانگی فرائض سے بیگانہ کر دے ...... ضربِ کلیم کی ایک نظم عورت میں عورت کو سرے سے جذبہ خودی سے ہی محروم قرار دے دیا ہے دراصل اقبالؔ کے اِس نظریاتی مدوجزر کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے مرد اور عورت کے باہمی رشتوں کو موجودہ نظام کے طریق پیداوار اور پیداواری رشتوں کی روشنی میں نہیں دیکھا تھا ...... تاہم جب اقبالؔ یہ کہتے ہیں :-

میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اِس عقدۂ مشکل کی کشود

تو ہم اس اعترافِ شکست پر دانتوں میں انگلی دبا کر رہ جاتے ہیں ــــ"

(ختم شد)